مسلمانوں کی غیر سائنسی ذہنیت سے خطرہ ہے، لیکن اس مضمون میں مصنف کے بعض خیالات میں الجھاؤ
اور تضاد ہے، جب انکے نزدیک اسلام ہی جامع، مکمل اور خدا کا پسندیدہ دین ہے تو اس کے اصول و احکام
سے انحراف کرنے والا کوئی شخص مسلم کس طرح ہو سکتا ہے؟ نیز قرآن کے ابدی حقائق و مسلمات اور
اسکی بنیادی تعلیمات ہر ہر صدی میں کس طرح بدل سکتی ہیں، ماضی میں اسلام کی جو تشریح و تعبیر کی گئی
ہے اسکو یکسر نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے، عہد رسالت کی تعبیر و تشریح کو بھی زمانی و مکانی اثرات سے
متاثر مان لیا جائے تو پھر دین کی کوئی محکم بنیاد باقی نہیں رہ جاتی، اور مدعیان تغیر و اصلاح وہی صدائیں
بلند کرنے لگیں گے جن کا ذکر وہ پاکستان کے تجدد پسندوں کی زبان سے کر چکے ہیں، اگر جدید ذہن "صرف رسوم
و روایات کا منکر ہے" تو اہل مذہب اسمیں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے لیکن اختلاف وہاں ہوتا ہے جب رسوم و روایات کے دائرہ کو اسقدر وسعت
دیجاتی ہے کہ مذہب کے اوامر و نواہی اسکی زد میں آجاتے ہیں، اشتراکیت صرف ایک معاشی نظام نہیں ہے بلکہ اسکے پیچھے خالص
مادی عقیدہ ہے، لیکن ایسے مادہ پرستوں کو بھی اگر مصنف مذہب کا منکر نہ سمجھیں تو یہ ان کے حسن ظن اور رواداری کی ایسی
کیفیت ہے، جس کی تائید نہیں کیجا سکتی ہے، اسلام کے اصولی و اعتقادی امور کو اجتہاد و تقلید کے مسائل سے بھی خلط ملط کر دیا
گیا ہے، "ما وجدنا علیہ آباءنا" کی پھبتی فقہی و جماعتی عصبیت میں گرفتار لوگوں پر تو کسی حد تک بجا ہو سکتی ہے، لیکن ائمہ مجتہدین
فی الدین پر اسکا اطلاق بے محل ہے، مختلف مسالک فقہ سے تعلق رکھنے والے اپنے ائمہ کو شریعت ساز نہیں سمجھتے بلکہ
کمال علم و تقوی کی بنا پر ان کے اجتہاد پر اعتماد کرتے ہیں، اور ان سے اللہ و رسول کے احکام معلوم کرتے ہیں مجددین
کے ذکر میں بھی کسقدر مغالطہ آمیزی ہے، جب انکا کام بقول مصنف مروجہ اسلام کے خلاف آواز اٹھانا ہے تو پھر اسکا مطلب اسکے سوا
اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ آج چودہ سو سال پہلے کے اصل اسلام کو جس پر رسوم و رواج اور بدعات و خرافات کا غبار جم گیا تھا از سر نو نمایاں
کر کے پیش کرتے ہیں، اسیطرح بعض اور مسائل میں بھی ترتیب مقدمات کی غلطی کی بنا پر مصنف نے جو نتائج نکالے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں
مصنف کا انداز تحریر سنجیدہ ہے اور انھوں نے ان مضامین کے ذریعہ جمود پسند ذہنوں میں ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ممکن ہے، اب بصیرت
حالات کا جائزہ لیکر زیادہ بہتر اور صحیح تر نتائج اخذ کر سکیں اور اس دور کے مشکل مسائل کو کتاب و سنت کی روشنی میں مجتہدین سلف کی
بحث و بصیرت کو وسیلہ بنا کر حل کر سکیں۔

"ض"

جلد ۱۱۶ ماہ اکتوبر ۱۹۷۵ء مطابق ماہ شوال المکرم ۱۳۹۵ھ عدد ۴

مضامین

شذرات

اگست کے معارف میں ندوہ کے جشن تعلیمی کی خبر دی جا چکی ہے، ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں چند بوریہ نشینوں نے ملت کی زبون حالی پر غور کیا، انھوں نے ماضی کے تجربوں اور اس وقت کے حالات کی روشنی میں زوال وانحطاط کے اسباب کا سراغ لگایا، اور ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا جس پر عمل کرکے ملت کی افسردگی دور ہو، اس کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑنے لگے، اس کے اندر نشاط پیدا ہو، اس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوں، اور وہ نئے جوش و ولولہ کے ساتھ کارگاہ حیات میں قدم رکھے، اور ایک بار پھر اپنی لیاقت وصلاحیت کا نقش جریدۂ عالم پر ثبت کردے،

اس لائحہ عمل کو مرتب کرنے والوں کے نزدیک ملت کی تباہی و بربادی کا سب سے بڑا سبب باہمی اختلافات تھے، ان کو معلوم تھا کہ تمام مسائل و معاملات میں ساری قوم کا متفق ہونا ممکن نہیں ہے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مذہبی سیاسی، معاشی اور تہذیبی امور میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے اور ہوتا رہے گا، لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس اختلاف رائے کو عداوت اور جنگ و جدل کی شکل میں تبدیل نہ کیا جائے، بلکہ صبر و تحمل سے دوسرے کی بات سنی جائے، اس کے جذبات کا احترام کیا جائے، اور باہم رواداری سے کام لیا جائے، اس طرح افراد اور جماعتوں کا اختلاف دشمنی کا رنگ نہ اختیار کرسکے گا، اور مختلف فرقوں اور گروہوں کی رنگا رنگی میں ملت کی یک رنگی باقی رہے گی، اور اختلاف کے باوجود قوم کی وحدت و یگانگت کا شیرازہ

گم نہ ہونے پائے گا،

ملت کی پستی اور زبون حالی کا دوسرا سبب ان بزرگوں کی نظر میں نصاب تعلیم تھا، اس وقت مسلمانوں کی تعلیم جدید و قدیم دو خانوں میں بٹی ہوئی تھی، جدید تعلیم گاہیں مذہبی تعلیم و تربیت سے خالی تھیں، اور مذہبی درسگاہیں عصری علوم و فنون سے تہی دامن تھیں، ندوہ کے بانیوں کی آرزو تھی، کہ اس دوعملی کا خاتمہ ہو، قدیم و جدید کے درمیان ربط کی تدبیر کی جائے، اور دین و دنیا کی باہم آمیزی سے وہ اکسیر تیار کی جائے جس سے ملت کے اندر زندگی کی روح پیدا ہو، اور اسلام کے نام لیواؤں میں ایسی صلاحیت پیدا ہو کہ وہ اس ظلمت کدۂ عالم کو پھر مطلع انوار بنادیں،

اس منصوبہ کو پیش کئے ہوئے پچاسی سال گزر گئے ہیں، ضرورت ہے کہ اس اجلاس میں اس طویل جد و جہد کا جائزہ لیا جائے، اور معلوم کیا جائے کہ ان مقاصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، ماضی کے تجربوں کی روشنی میں حال پر نظر ڈالی جائے، لغزشوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کی جائے، اور ان کے اسباب و علل پر غور کرکے نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ مستقبل کا نقشہ بنایا جائے، زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے، اور حالات نے بالکل نیا رنگ اختیار کیا ہے، اس وقت جن مسائل سے ہم دوچار ہیں، ان کو حل کرنے کے لئے علم و بصیرت اور حکمت و معرفت کے ساتھ ہمت و جرأت بھی درکار ہے،

اس اجلاس میں شرکت کے لئے علماء و مشائخ، زعماء و ارباب سیاست اور ماہرین

تعلیم و تربیت سبھی طبقوں کے سربرآوردہ اصحاب کو دعوت دی گئی ہے، اس میں ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک کے نمایندے بھی شریک ہو رہے ہیں، شیخ الازہر نے اس جلسہ کی صدارت منظور کرلی ہے، اور مصر، شام، سعودی عرب، کویت، تونس، الجزائر، اور خلیج فارس کی ریاستوں کے نمایندے شرکت کے لئے آرہے ہیں، دوسرے ملکوں سے بھی خط و کتابت ہو رہی ہے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ اجلاس اپنی نوعیت میں منفرد ہوگا، اور اس کے انعقاد سے ملک و ملت کو بہت فائدہ پہونچے گا،

افسوس ہے کہ گذشتہ ماہ مولانا محمد شاہد فاخری نے وفات پائی، وہ الہ آباد کے مشہور مذہبی خانوادہ دائرہ شاہ اجمل سے تعلق رکھتے تھے، مذہبی کاموں کے ساتھ ان کو ملک کے سماجی اور سیاسی مسائل سے بھی دلچسپی تھی، وہ جمعیۃ علمائے ہند کے نائب صدر تھے، انھوں نے آزادی کی جد و جہد میں نمایاں حصہ لیا تھا، اور قید و بند میں بھی مبتلا ہوئے تھے، آزادی کے بعد بھی وہ ملک و ملت کی خدمت میں لگے رہے، اور اس راہ میں مشکلات و مصائب برداشت کرتے رہے، وہ دارالمصنفین کے کاموں کے بڑے قدرداں اور مداح تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور انھیں اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے،

اس سال دارالمصنفین کی دو نئی کتابیں غالب (مدح و قدح کی روشنی میں) اور تذکرۃ المحدثین جلد دوم چھپ رہی ہیں، جو امید ہے کہ جلد شائع ہو کر دارالمصنفین کے دوامی ارکین اور عام شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی،

مقالات

دیارِ پورب کا تیسرا دور

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۳)

سلطان محمد عالمگیر ۱۰۶۸ھ تا ۱۱۱۸ھ

شاہجہان کے بعد اس کے بیٹے عالمگیر نے تخت و تاج پایا، وہ عالم باعمل اور فقیری اور شہنشاہی کے جامع تھے، علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کے ساتھ شرعی احکام میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے، اور علماء و فضلاء اور مشائخ کے قدرداں تھے، ان کے دور میں ہندوستان میں اسلامی علوم و معارف کو بڑا فروغ ہوا اور علماء کی خوب قدر و منزلت ہوئی، انھوں نے مستند و متدین ارباب علم کو جمع کر کے فتاویٰ ہندیہ یا فتاویٰ عالمگیری مدون کرائی جو اسلامی فقہ پر پورے عالم اسلام میں اپنی نوعیت کا پہلا کام تھا، اس کتاب کو بعد کے ادوار میں اسلامی فقہ کی تدوین و ترتیب کے سلسلہ میں سنگ میل کہا جاسکتا ہے، عالمگیر کے پچاس سالہ دور سلطنت میں بلادِ پورب بغداد و قرطبہ کی ہمسری کرتے تھے، مولوی خیرالدین محمد نے تذکرۃ العلماء[1] میں شیخ محمد ماہ جونپوری دیوگامی کے تذکرہ میں لکھا ہے،

درواقعات عالمگیری مسطور است کہ اورنگ زیب	واقعات عالمگیری میں ہے کہ اورنگ زیب

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۵۰

عالمگیر بادشاہ عالم باعمل و عامل باعلم
بود، قدر دانی علماء بیش از بیش می نمود
واز عہد شاہزادگی منظور داشت تا
جونپور مثل زمان سلاطین شرقیہ از کثرت
فضلاء و مشائخان وانبوہ و ہجوم طلبۂ
علوم و کاسبان فیوض رونق پذیر باشد
چون بر سریر سلطنت نشست یرلیغ
واجب التبلیغ بناظم جونپور جہت ترقیم
احوال مدرسان و مشائخان این شہر
صادر گردانید، و سوانح نگاران و
وقائع نویسان را احکام تہدید برائے
تحقیقات کوائف بود و باش این گروہ
فرستاد،

القصہ در عہد آنحضرت نمونۂ گلزار ارم
شدہ در تمام شہر و قصبات و نواحی آں
مدرسہائے قدیم تاسیس یافتند و لیسے
خانقاہ و مدرسہ تعمیر جدید شدند چنانچہ
در مفتی محلہ میر ابو البقاء و میر مبارک
و ملا محمد حفیظ، در محلہ شاہ مدار مولانا

عالمگیر عالم باعمل اور عامل باعلم بادشاہ
تھے وہ زیادہ سے زیادہ علماء کی قدر
دانی کرتے تھے، شاہزادگی کے زمانہ ہی
سے اس کا خیال رکھتے تھے کہ جونپور علماء
و فضلاء اور مشائخ کی کثرت اور طلبۂ علوم کے
انبوہ اور کاسبان فیوض کی زیادتی میں
سلاطین شرقیہ کے زمانہ کی طرح رونق
پذیر ہو، چنانچہ جب وہ بادشاہ ہوئے تو
شہر جونپور کے مدرسین و مشائخ کے حالات لکھنے
کا حکم ناظم جونپور کو دیا، اور سوانح نگاروں
اور وقائع نویسوں کو تاکید کی کہ وہ اس
جماعت کے بود و باش کے بارے میں
معلومات بہم پہونچائیں،

القصہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سلطنت
میں جونپور گلزار ارم ہوگیا، شہر اور
اطراف کے قصبات میں قدیم مدارس کی
جدید تعمیر و تاسیس ہوئی اور بہت سے نئے مدارس اور خانقاہیں
تعمیر ہوئیں چنانچہ مفتی محلہ میں مدرسہ میر ابو البقاء اور مدرسہ میر مبارک
اور مدرسہ ملا محمد حفیظ، محلہ شاہ مدار میں

میر نور الدین، و در محلہ دریبہ میر عبد الباقی
و در محلہ سپاہ فرزندان شیخ محمود، ہم
چنان در ہر محلہ جونپور مدرسہ بود کہ در آن
مدرسے تعلیم فیوض طالبان می پرداخت
و در ہر کوچہ خانقاہے، کہ درویشے در آن
کاسبان فیوض حق را رہبری می ساختند

مدرسہ مولانا نور الدین محلہ دریبہ میں مدرسہ
میر عبد الباری محلہ سپاہ میں، مدرسہ فرزندان
شیخ محمود قائم ہوئے، اسی طرح جونپور کے
ہر محلہ میں مدرسہ جاری تھا، ان مدرسوں
میں مدرسین طلبۂ علوم کو درس دیا کرتے
تھے، اور ہر گلی میں خانقاہ تھی جس میں مرشدین
بھی فیوض جاری رکھتے تھے،

معلوم ہو چکا ہے کہ شاہجہاں اور امیر الامراء شائستہ خان، مولانا ابو الخیر بھیروی
کے قدر دانوں میں تھے، اور ان دونوں نے مولانا کی عزت اور احترام میں کوئی کسر باقی نہیں
رکھی، ان کے لڑکے شیخ اسمٰعیل بن شیخ ابو الخیر بھیروی متوفی ۱۱۰۶ھ اپنے زمانہ
کے مشہور صوفیہ و مشائخ میں سے تھے، انھوں نے برہان پور میں میر سید شبیر محمد سے
تعلیم و بیعت پائی تھی، قیام برہان پور ہی کے زمانہ میں انکی بزرگی کا شہرہ ہو گیا تھا، اس
زمانہ میں شاہزادہ عالمگیر اس علاقہ کے ناظم تھے، انھوں نے میر سید شبیر محمد سے دہلی کی
سلطنت کے لئے دعا کی درخواست کی، میر صاحب نے شیخ اسمٰعیل سے بھی رجوع
کرنے کو ارشاد کیا، چنانچہ شاہزادہ عالمگیر نے ان سے بھی دعا کی درخواست کی، جب
سلطنت مل گئی، تو سلطان عالمگیر نے میر سید شبیر محمد کو لکھا کہ شیخ اسمٰعیل کو دہلی آنے
پر راضی کریں، اس درمیان میں شیخ صاحب بھیرا واپس آگئے تھے، میر صاحب نے
سلطان کو صورت حال سے مطلع کیا، اس نے ناظم الہ آباد خانجہان کو لکھا کہ جیسے ہو سکے

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۱۵

شیخ اسمٰعیل کو ادب و احترام کے ساتھ اردوئے معلیٰ میں پہونچایا جائے، ناظم الہ باد نے بہت کوشش کی مگر شیخ صاحب اپنا آستانہ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئے، امیر الامراء نواب شایستہ خان بن شیخ ابو الخیر کی طرح ان کے صاحبزادے شیخ اسمٰعیل سے بھی عقیدت رکھتا تھا، اور وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا،

شیخ محمد واصل شمس پوری کا بیان ہے کہ میں جس زمانہ میں ناظم جونپور کے یہاں سپہ گری میں تھا، اتفاق سے دائرہ شکر محمد آباد گہنہ پہونچا، یہاں سے شیخ اسمٰعیل کا آستانہ بہت قریب تھا، ہم چند سپاہی شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی زیارت و دعا سے فیضیاب ہوئے۔

شیخ اسمٰعیل کے دوستوں میں دو بھائی قاضی نور اللہ گوپال پوری، اور قاضی خوب اللہ گوپال پوری تھے، قاضی خوب اللہ کو راجہ عظمت خان نے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ اپنے یہاں عظمت گڈھ (اعظم گڈھ) بلایا مگر کچھ دنوں کے بعد نامساعد حالات کی بنا پر ان کا وظیفہ نہ دے سکا، جب شیخ اسمٰعیل کو قاضی خوب اللہ کی پریشانی کا حال ان کے بھائی کے ذریعہ معلوم ہوا تو ان کے حق میں کلمۂ خیر کہا، اور دعا کی، قاضی خوب اللہ عظمت گڈھ سے برداشتہ خاطر ہو کر تلاش معاش میں دہلی چلے گئے، جب بادشاہ عالمگیر کو ان کے علمی و دینی مرتبہ کا پتہ چلا تو خصوصی توجہ کی۔[۱]

مفتی نور اللہ بن شیخ حسین بنارسی متوفی ۱۱۰۰ھ عہد عالمگیری میں بنارس کے قاضی و مفتی تھے، سلطان ان کا بڑا معتقد تھا، ان کے لیے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی، محلہ دارانگر میں شاہزادگی کے دور میں ایک شاندار سنگین مسجد بنوائی جو مسجد عالمگیری اور مسجد فوارہ کے نام سے مشہور رہے، اس کے بعد عالمگیر کے حکم سے مفتی صاحب کے لئے ایک عالی شان خانقاہ

---

[۱] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی،

تعمیر ہوئی۔

مفتی نور اللہ کے صاحبزادے مولانا حافظ امان اللہ بنارسی متوفی ۱۱۳۳ھ بھی عالمگیر کی عنایات و توجہات کا مرکز تھے، عالمگیر نے ان کو لکھنؤ کی صدارت عطا کی، جب کہ ان کے ہم سبق اور استاد بھائی قاضی محب اللہ بہاری کو وہاں کا قاضی مقرر کیا، اور دونوں معاصر فضلاء میں علمی بحث و مباحثہ کی سرگرمیاں رہیں۔[۱]

شیخ عبد اللطیف بن عبد الہادی مٹھن پوری دیوان محمد رشید کے خلفاء میں سے تھے اور ان کے صاحبزادے محمد ارشد کے خسر تھے، ان کا وطن نظام آباد کے نواح میں مٹھن پور تھا، ان سے عالمگیر کے گہرے تعلقات تھے، اس نے رقعات میں ان کے متعلق شیخ عبد اللطیف قدس سرہ شریف می فرمود، لکھا ہے،

اسی دور میں میر سید قیام الدین سگڑوی گورکھپوری متوفی ۱۱۲۶ھ دیوان محمد رشید جونپوری کے مرید و خلیفہ بڑے زاہد و عابد اور مرتاض درویش تھے، وطن نواح سگڑی (اعظم گڈھ) میں تھا، مگر بعد میں گورکھپور میں قیام کیا، سبز پوش خاندان کا تعلق ان ہی سے ہے، ۲۸ صفر ۱۱۲۶ھ کو انتقال کیا۔[۲]

قاضی خلیل الرحمٰن گورکھپوری زبردست عالم اور بہت نیک آدمی تھے، فدائی خان والی گورکھپور نے ان کے بارے میں عالمگیر سے سفارش کی، سلطان نے ان کی طرف خصوصی توجہ کی اور شاہی عہدہ دیا، اور آخر میں گورکھپور کا حاکم بنایا۔

مولانا ابو الواعظ بن صدر الدین ہرگامی مشاہیر اہل علم میں سے تھے، عالمگیر نے ان سے تعلیم پائی تھی، اور فتاوی عالمگیری کے جامعین و مولفین میں ان کو بھی رکھا تھا،

---

[۱] سبحۃ المرجان ص ۸۰، و مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۲ [۲] سمات الاخیار ص ۶۴،

شیخ احمد بن عبداللطیف بلگرامی متوفی ۱۰۹۶ھ نہایت خوش خلق عالم ہونے کے ساتھ حساب و ریاضی میں مہارت تامہ رکھتے تھے، عالمگیر کے حاکم مکرم خان نے ان کو مقام بھاسو کا حاکم بنایا تھا،

شیخ پیر محمد سلونی متوفی ۱۰۹۹ھ نے اس دیار میں تبلیغ اسلام کر کے بہت سے سنیاسیوں کو دولت دین و ایمان سے مالامال کیا، بڑے بڑے علماء و فضلاء ان کے تلامذہ و مریدین میں تھے عالمگیر نے ان کو کئی گاؤں جاگیر میں عطا کئے جو مدتوں ان کے خاندان میں باقی رہے،

قاضی علی اکبر حسینی الہ آبادی متوفی ۱۰۹۰ھ کو وزیر سعد اللہ خان نے اپنے لڑکے لطف اللہ کا معلم بنایا، اور لطف اللہ نے ان سے بھرپور استفادہ کیا، پھر وزیر سعد اللہ خان نے ان کو عالمگیر سے ملایا، اور سلطان نے شاہزادہ محمد اعظم کا معلم بنایا، بعد میں ان کو لاہور کا قاضی بنا دیا، جہاں وہ باقی عمر رہے قاضی علی اکبر بھی فتاوے عالمگیری کے جامعین و مولفین میں سے تھے

مولانا محمد صادق بن مفتی ابوالبقار جونپوری کو عالمگیر نے شاہزادہ ، محمد معظم کا معلم بنایا، اس نے ایک زمانہ تک مولانا سے استفادہ کیا، عالمگیر کے بعد جب محمد معظم بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے استاد کو جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں جاگیر عنایت کی، وہیں چلے گئے، اور وہیں فوت ہو گئے۔

مفتی وجیہ الدین گوپاموی متوفی ۱۰۸۳ھ کو عالمگیر نے فتاوے عالمگیری کی تدوین و تالیف کے سلسلہ میں اعلیٰ عہدہ پہ رکھا تھا، ان کی نگرانی میں علماء و فقہاء فتاوے مرتب کرتے تھے، اور خود انھوں نے اس کتاب کا کافی حصہ مدون کیا ہے،

مولانا قطب الدین سہالوی شہید ۱۱۰۳ھ کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ محمد سعید عالمگیر کی خدمت میں پہونچے اور اپنے والد کی مظلومانہ شہادت کی اور ظالموں

بیاوتی کا ذکر کیا، سلطان نے ان کو لکھنؤ میں ایک فرنگی تاجر کی کوٹھی عطا کی جو بعد میں علماء فرنگی محل کا مرکز بنی۔

مولانا احمد بن ابو سعید (ملا جیون) امیٹھوی متوفی ۱۱۳۰ھ مصنف نور الانوار و تفسیر احمدی دکن میں چھ سال تک عالمگیر کی فوج میں دینی خدمت انجام دیتے رہے، جب شاہ عالم بن عالمگیر دکن سے واپس ہوا تو مولانا نے اجمیر میں اس کا استقبال کیا، اور اسی کے ساتھ لاہور جا کر قیام کیا، اس کے انتقال کے بعد دہلی آکر فرخ سیر سے متعلق ہو گئے، عالمگیر سے ان کے تعلقات کے عجیب عجیب واقعات مشہور ہیں، شیخ احمد بن ابو منصور گوپاموی ملا جیون کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، فقہ و اصول فقہ اور عربیت میں مہارت تامہ رکھتے تھے، عالمگیر نے فتاوی عالمگیری کی تدوین و تالیف میں، ان کو شریک کر کے روزانہ ایک روپیہ اور کچھ غلہ بطور وظیفہ کے مقرر کیا تھا،

مولانا جلال الدین مچھلی شہری بھی فقہ و اصول فقہ کے مشہور عالم تھے، عالمگیر نے ان کو بھی فتاوی عالمگیری کی تدوین میں شریک کیا تھا، ایک روایت کے مطابق اسکی پہلی جلد ان ہی کی مرتب کردہ ہے،

قاضی حبیب اللہ جونپوری متوفی ۱۱۰۵ھ عالمگیر کی طرف سے جونپور کے قاضی تھے، اس کے بعد ڈھاکہ کے قاضی بنائے گئے جہاں پوری زندگی بسر کی، نہایت متقی اور بڑے دیندار عالم تھے، ڈھاکہ میں ایک شخص نے سب شیخین کیا تو اس کے قتل کا حکم دیا، حالانکہ وہاں کا حاکم بھی اس وقت اس کا ہم مذہب تھا، مگر اس کی پروا نہیں کی،

شیخ سعد اللہ سلونی (م ۱۱۳۵ھ) شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے، حج و زیارت سے واپسی پر سورت میں قیام پذیر ہو گئے، عالمگیر نے ان کو جاگیر میں گاؤں عطا کئے جن سے سالانہ

آٹھ ہزار روپیہ کی آمدنی تھی، عالمگیر ان کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا، ان کے اشارے پر چلتا تھا اور ان کی سفارش قبول کرتا تھا، ان کے خطوط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا، ایک مرتبہ شیخ سعد اللہ نے ایک حاکم کے بارے میں سفارش کی تو اس کا جواب عالمگیر نے خود نہیں لکھا بلکہ دوسرے سے لکھوایا کہ آپ جیسے عالم دین کے لیے زیبا نہیں ہے کہ ظالموں کے بارے میں مجھے خطاب کریں، شیخ سعد اللہ بارہ اماموں کی محبت وعقیدت کے لیے عالمگیر کو اکثر خطوط لکھا کرتے تھے، جب اس کا سلسلہ بہت زیادہ ہو گیا تو عالمگیر نے درباری علماء سے بطور اظہار واقعہ کہا کہ شیخ سعد اللہ اہل بیت کی محبت کے بارے میں مجھے برابر تاکیدی خطوط لکھتے رہتے ہیں، اور یہ صحیح بھی ہے، مگر اہل سنت والجماعت کے نزدیک، امامت صرف بارہ ائمہ میں منحصر نہیں ہے، اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عالمگیر دین کو تعلقات پر کس اہتمام کے ساتھ مقدم رکھتے تھے۔

مفتی شرف الدین لکھنوی متوفی سنہ ۱۱۳۳ھ کو عالمگیر کی طرف سے چہار صدی ذات کے منصب کے ساتھ بعض شرعی خدمات سپرد کی گئی تھیں وہ محمد شاہ کے دور سلطنت تک اسی عہدہ پر رہے اس کے بعد سہ ہزاری ذات کا اضافہ ہوا، اور فدائی خان کے نائب کی حیثیت سے کئی سال تک رہے۔

مولانا شکر اللہ جنیدی جونپوری متوفی سنہ ۱۱۳۵ھ اپنے والد کے حکم ومشورہ سے عالمگیر کی خدمت میں بیجاپور گئے، عالمگیر نے ان کی آمد کو غنیمت جان کر شاہی عنایات سے نوازا

میر عبد الجلیل بلگرامی متوفی سنہ ۱۱۳۸ھ نے دکن جا کر عالمگیر سے ملاقات کی، اس نے ان کو لاہور کے علاقہ گجرات کی بخشی گری اور وقائع نگاری پر مامور کیا، پھر سندھ کے علاقہ بھکر اور سیوستان میں اسی عہدہ پر رکھا جہاں سنہ ۱۱۱۶ھ تک رہے، اور فرخ سیر کے دور میں یہ عہدہ ان کے صاحبزادے سید محمد بن عبد الجلیل کے سپرد ہوا۔

قاضی عبد الصمد جونپوری فقہ کے ماہر تھے، دہلی جا کر فتاوے عالمگیری کی تدوین میں شریک ہوئے، پھر دکن میں ایک مقام کے قاضی مقرر کئے گئے، آخر میں لکھنؤ میں مقیم ہوئے، عالمگیر نے کئی دیہات کی جاگیر عطا کی،

مولانا عبد الہادی بلگرامی متوفی سنہ ۱۱۳۳ھ فراغت کے بعد عالمگیر کے شاہی لشکر میں گئے، اور اس نے ان کے علم وفضل کو دیکھ کر صوبہ الہ آباد میں ایک منصب دیکر ایک گاؤں جاگیر میں عنایت کیا۔

قاضی عصمت اللہ لکھنوی متوفی سنہ ۱۱۱۳ھ عالمگیری دربار سے منسلک رہے، پہلے مراد آباد کے حاکم مقرر کئے گئے، پھر دوسرے شہروں کی حکومت ملی،

شیخ غلام محمد لکھنوی متوفی سنہ ۱۱۳۶ھ علمائے ربانی میں سے تھے، عالمگیر نے ان کو لشکر کا محتسب بنایا تھا، جہاں وہ بڑی مستعدی اور ذمہ داری سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت انجام دیتے تھے، عالمگیر نے ان کی ذمہ دارانہ زندگی دیکھ کر عہدۂ قضا پیش کیا مگر انھوں نے اسے قبول نہیں فرمایا،

مولانا محمد اسعد پھالوی بڑے پایہ کے عالم تھے، عالمگیر نے ان کو برہان پور کا صدر بنایا تھا،

شیخ محمد انور گوپامئوی متوفی سنہ ۱۱۱۱ھ شاہجہان کے دور میں تسبیح خانہ کے نگران تھے، جب شاہجہان کے شاہزادوں میں سلطنت کے لیے کشمکش ہوئی تو یہ ملازمت چھوڑ کر وطن چلے آئے، اور عالمگیر کا دور سلطنت آیا تو اس کی خدمت میں امام غزالی کا ایک رسالہ جو ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، پیش کیا، عالمگیر اس نادر علمی ہدیہ پر

بہت خوش ہوا، اور دریافت کیا کہ کیا آپ کے خاندان مین کوئی شخص حکومت میں ملازمت کرتا تھا، ؟ شیخ محمد انور نے جواب دیا کہ ہمارے خاندان کے لوگ اللہ تعالےٰ کے ملازم تھے، بد قسمتی سے ایک مین حکومت کا ملازم تھا، یہ جواب عالمگیر کو بہت پسند آیا، اور اس نے ان کو بخشی کا دبیر مقرر کیا، شیخ محمد انور حج کو جانے لگے تو عالمگیر نے تین لاکھ کی رقم دی تاکہ فقرائے حرمین شریفین مین تقسیم کردی جائے، شیخ صاحب نے سورت مین اس رقم سے چاول، اور کپڑے خرید کر جدہ میں ان کو فروخت کیا جس سے نو لاکھ کی رقم حاصل ہوئی، اور حرمین شریفین کے حاجت مندوں مین تقسیم کی گئی۔

شیخ محمد حنیف کنتوری کو عالمگیر نے دکن میں مقام سنگمیر کی بخشیگری اور وقائع نگاری کا منصب دیا جہاں وہ ایک زمانہ تک رہے، بعد میں خلد آباد (روضہ) کے قاضی ہوئے۔

شیخ محمد غوث کاکوری متوفی سنہ ۱۱۱۸ھ کو بھی عالمگیر نے فتاوی کی تالیف میں شریک کیا تھا، اس کی تکمیل کے بعد اودھ میں خراج کی وصولی پر مقرر کیا۔[1]

عالمگیری دور میں قاضی محمد صالح بن شیخ کمال الدین ساکن گھہرا (مبارکپور) اس دیار کے قاضی تھے، انھوں نے سنہ ۱۰۹۹ھ میں یہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی، جو عالمگیری مسجد کے نام سے مشہور رہی، اور اب خستہ ہورہی ہے، اس میں تین در، تین گنبد اور دائیں بائیں دو مینارے ہیں، بیرونی فرش کے سامنے اوپر سنگ موسیٰ کا ایک کتبہ ہے جس میں یہ اشعار بخط جلی کندہ ہیں،

در زمان شاہ عالمگیر دین پرور گزد	رونق دین محمد ہست افزوں از قیاس
شد بنا از فیض خورشید کرم للمتقین	مسجدے کز نور آن انجم نماید اقتباس

[1] ان واقعات کے لیے نزہۃ الخواطر، تجلی نور، آثر الکرام، تذکرہ علمائے ہند وغیرہ ملاحظہ ہوں۔

عاملان ہوش گفتند از کمال کیست این	گفتم از ابن الکمال است کمال حق شناس
رفعت شانش بہ بیت اللہ می نازد بہ فضل	ذرہ از جبش باوج آسمان گردہ اساس

سال تاریخش بپرسیدم زپیر عقل گفت
از محمد صالح است این مسجد احسن اساس[1]
سنہ ۱۰۹۹ھ

عالمگیر کے بعد کے تیموری سلاطین، عالمگیر کے بعد تھوڑے وقفہ سے کئی بادشاہ گذرے ہیں، مگر مورخین نے محمد شاہ کو خاتم السلاطین لکھا ہے، کیونکہ ان بادشاہوں کی حکومت برائے نام تھی، اور ان کا دور اندرونی اور بیرونی انتشار و خلفشار سے مملو و مشحون تھا، علم و علماء کی محفلیں اجڑ رہی تھیں، اور مدرسوں اور خانقاہوں کا سکون و اطمینان ختم ہورہا تھا بہت سے علماء ملک کی مختلف نوابوں اور رئیسوں کے یہاں سے چلے گئے، اور کچھ اب بھی دہلی سے منسلک رہے۔

پہلے گذر چکا ہے کہ مولانا محمد صادق جونپوری کو عالمگیر نے شاہزادہ محمد معظم کا معلم بنایا تھا، جب محمد معظم کا دور سلطنت آیا، تو اس نے جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں ان کو منصب اور جاگیر سے نوازا،

مولانا غلام نقشبند گھوسوی، لکھنوی متوفی سنہ ۱۱۲۶ھ سے شاہ عالم نے نیازمندانہ ملاقات کی اور ان کے ادب و احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا،

قاضی عبد الصمد چریاکوٹی متوفی سنہ ۱۱۱۷ھ اپنے والد کے حکم سے پرگنہ چریاکوٹ کے موروثی عہدۂ قضا کے لیے دہلی گئے، جہاں ارکان دولت اور علماء فضلائے انکے علم و فضل کا اعتراف کیا اور محمد شاہ نے ان کو پرگنہ چریاکوٹ کا قاضی بنایا۔

شیخ ابو النجیب امیٹھوی کو والئ لکھنؤ خدائی خان نے اپنے مقربین شامل کرکے

[1] تذکرۂ علمائے مبارکپور ص ۸۴

ان کا وظیفہ مقرر کیا جس سے وہ ایک مدت تک متمتع ہوتے رہے،

قاضی تاج الدین دیوی متوفی ۱۱۵۵ھ محمد شاہ کے دور سلطنت میں دہلی کے قاضی القضاۃ تھے،

مولانا حمد اللہ سندیلوی مصنف شرح سلم نواب اودھ ابوالمنصور صفدر جنگ کی سفارش سے احمد شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے، اور بادشاہ نے ان کو فضل اللہ خان کا خطاب دے کر کئی دیہات جاگیر میں عنایت کئے، اس کے بعد مولانا نے سندیلہ میں ایک بڑا مدرسہ تعمیر کیا۔

مولانا روح اللہ بلگرامی متوفی ۱۱۵۱ھ نے دہلی جاکر وزیر منعم خان سے ملاقات کی اور وہ آپ کے علم و فضل کا گرویدہ ہوگیا، مگر جلد ہی اس کا انتقال ہوگیا، تو مولانا سردار خان کی طرف سے الہ آباد کے نائب حاکم مقرر کئے گئے، پھر نواب سربلند خان نے ان کو سیال کوٹ اور جالندھر وغیرہ کے بارہ علاقوں کا حاکم بنایا، کچھ مدت کے بعد نواب متور خان والی شاہ جہان پور کے پاس رہے، اس کے بعد نواب مظفرالدولہ کی طرف سے اودھ کے نائب حاکم ہوئے پھر محمد خان بنگش سے وابستہ ہوگئے، اور آخر میں برہان الملک کے ساتھ نادر شاہ سے جنگ میں شریک ہوئے

شیخ صدر جہان صفی پوری فرخ آباد میں نواب فخرالدولہ سے وابستہ رہے، اور رجب ۱۱۹۵ھ میں قتل کر دیا گیا تو اپنے وطن صفی پور چلے آئے۔

مولانا عبداللہ بلگرامی متوفی ۱۱۳۲ھ نواب سربلند خان کی خدمت میں پہونچے اس نے فوج میں عدل کا عہدہ دار بنایا، اور ۱۱۲۴ھ میں احمد آباد کی صدارت دی،

مولانا عسکری سندیلوی دہلی جاکر ابوالمنصور خاں صفدر جنگ سے وابستہ ہوئے، اس نے ان کو احمد شاہ کی خدمت میں پیش کیا، احمد شاہ نے ان کو خیراللہ خان کا لقب

دیکر اودھ میں کئی دیہات کی جاگیر دی تاکہ مدرسہ بنائیں، چنانچہ مولانا موصوف نے دہلی سے واپس آکر سندیلہ میں ۱۱۰۶ھ میں مدرسۂ منصوریہ تعمیر کیا،

گذر چکا ہے کہ شیخ محمد بن عبدالجلیل بلگرامی متوفی ۱۱۸۵ھ فرخ سیر کے دور سلطنت میں اپنے والد کی جگہ بھکر اور سیوستان میں بخشی اور وقائع نویس بنائے گئے تھے، اور جب نادر شاہ کا فتنہ برپا ہوا تو وطن چلے آئے، شیخ محمد اشرف بلگرامی متوفی ۱۱۹۵ھ تلاش معاش میں دہلی گئے، اور بہت دنوں تک محمد اعظم شاہ کے مصاحبین میں رہے، اس کے بعد مبارز الملک اور صفدر جنگ سے وابستہ ہوگئے۔

قاضی محمد پناہ جونپوری اس وقت دہلی پہونچے جب کہ نادر شاہ حدود دہلی میں موجود تھا، محمد شاہ نے دہلی کے علماء کو بلایا تاکہ وہ نادر خان کے جلو میں آنے والے علماء سے مسئلہ فنال میں مناظرہ کریں، اس نازک موقع پر علمائے دہلی نے قاضی محمد پناہ کو اپنا نمائندہ بنا کر آگے بڑھایا، اور انھوں نے نادر شاہی علماء و فضلاء کو مناظرہ میں خاموش کر دیا نادر خان ان کی قابلیت دیکھکر مستعد خان کا خطاب دیا، اس کے بعد محمد شاہ نے ان کو جونپور کا قاضی مقرر کیا،

مولانا محمد شاکر لکھنوی متوفی ۱۲۳۳ھ نے شاہ عالم کے حکم سے قصیدہ بردہ کی شرح لکھی تھی، اور اس کا صلہ پایا تھا:

ان چند واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ دیار پورب کی جو علمی و دینی محفل سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ۷۰۳ھ سے ابتک بھی ہوئی تھی، اور فیروزیوں، شرقیوں، لودیوں، اور تیموریوں کے انقلابات کا کوئی اثر اس پر نہیں پڑا تھا، اب اس میں ضعف و اضمحلال آنے لگا، اور علماء فضلاء بے حال و پریشان ہو کر مدرسوں اور خانقاہوں سے

نکلنے پر مجبور نظر نے لگے، سنہ ۱۱۳۰ھ کے بعد دہلی کی مرکزیت طوائف الملوکی سے بدل گئی، اس بدامنی میں علمی مراکز بھی تباہی سے دو چار ہوئے، مدتوں کے جمے ہوئے مدرسے اکھڑ گئے، خانقاہیں ویران ہوگئیں اور علماء و طلبہ ادھر اُدھر منتشر ہوگئے مورخین بغداد: کی تباہی کو رو تے ہیں، لیکن ہندوستان کی بربادی کی داستان اس سے کچھ کم دردناک نہیں ہے، موقع ملا تو کبھی یہ قصۂ غم بھی سنایا جائے گا،

حیاتِ شبلی

(طبع دوم)

مولانا شبلی کی بہت مفصل سوانح عمری جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کے رقم قلم سے، جس کے عالمانہ، فاضلانہ، اور محققانہ مقدمہ میں جو اس کتاب کا شاہکار ہے، موجودہ اتر پردیش کے مشرقی و شمالی اضلاع بنارس، جونپور، غازیپور، اعظم گڈھ کے بہت سے علماء و فضلاء و اصحاب درس و تدریس مثلاً حافظ امان اللہ بنارسی، ملا باب اللہ، مولانا الہداد، ملا افضل، دیوان عبدالرشید، ملا محمود، مولانا کرامت علی، مولانا سخاوت علی جونپوری، اور پھر مولانا شبلی کے ہم عصر علماء مولانا فاروق چریاکوٹی، مولانا سلامت اللہ جیراجپوری، اور حافظ عبداللہ غازیپوری وغیرہ کا ذکر اجمال کے ساتھ آگیا ہے، اس کے بعد اصل کتاب ہو جس میں مولانا شبلی کی زندگی کے ہر پہلو پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت: عـــ۲۲ـــہ

منیجر

مولانا شمس الحق عظیم آبادی

از مولوی محمد عزیر صاحب بہاری مرکزی دار العلوم بنارس

(۳)

مرض وفات

سنہ ۱۱-۱۹۱۰ء میں طاعون کی بیماری پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی، بہار میں مولانا کا ضلع پٹنہ خاص طور پر اس کی زد میں تھا۔ مولانا کے موضع ڈیانواں کی کیفیت خود ان ہی کی زبانی ملاحظہ ہو، وہ وفات سے سات روز قبل ۱۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۴ مارچ سنہ ۱۹۱۱ء کو مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کے نام اپنے ایک گرامی نامہ لکھتے ہیں۔

"...... ہم عرصہ سے علیل ہیں، اور ضعف غالب ہوتا جاتا ہے، اور غذا بہت کم، اس لیے بغرض تبدیل آب و ہوا، ڈیانواں سے مع سامان سفر روانہ ہوتے پہلے جبل راجگیر پر اقامت چاہتے تھے، پھر بعد یکماہ کے سفر دہلی وغیرہ میں کرتے، اسی خیال سے اپنے سب طالب علموں کو بھی رخصت کر دیا۔ اور سب کام بند کر کے روانہ ہوئے ... بعد روانگی میرے معلوم ہوا کہ ڈیانواں میں بھی طاعون آگیا اور بہت زور ہے، مجبوراً نہایت حیرانی و پریشانی کی حالت میں واپس آئے اور اللہ اللہ علامت یوم یفر المرء من اخیہ کی پایا۔ ایسا چھوٹا قریہ اور یہ حالت، اللہ تعالیٰ رحم فرمادے اور امن عطا کرے، میرے سارے خدام بیمار اور بعض بعض بخوف دوسری دوسری جگہوں میں چلے گئے، عجیب نازک حالت ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے

میرے، مختار و منشی اور جو لوگ کام دفتر کا کرنے والے ہیں، سب کے سب پہلے روانہ ہوگئے، یہ قریہ گویا اس وقت خالی ہے، ہم اس وقت یہ خط لکھتے ہیں اور طبیعت بالکل حاضر نہیں ہے . . . . . اللہ اللہ ہر دن دو تین موتیں ہوتی ہیں۔ سارے لوگ جھونپڑیوں میں بدحواس ہیں، اشخاص چند اندر مکان کے بستے ہیں، یہ قریہ صغیرہ حکم میں قریہ کبیرہ کے ہے، چونکہ ساری اشیاء ما یحتاج الیہا ہر وقت ملتی ہیں، مگر آج کل چونکہ سارے لوگ بھاگے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ کی چینی بھی نہیں ملتی ہے۔ اللہ تعالے رحم فرما دے[1]

ڈیانواں آنے کے چند ہی روز بعد ۱۳ ربیع الاول مطابق ۱۵ مارچ کو وہ خود طاعون کے مرض میں مبتلا ہوئے، اور چھ دن بعد ۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ ۲۱ مارچ ۱۹۱۱ء کو بروز سہ شنبہ ۹ بجے صبح ۵۶ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بقول مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی "جس وقت کہ دنیا کا آفتاب طلوع ہوا تھا اسی وقت دین کا آفتاب (شمس الحق) غروب ہوا[2]"

ان کی وفات پر بہت سے اہل علم نے قطعات تاریخ، اور شعراء نے اردو، فارسی اور عربی میں مرثیے لکھے، علماء نے تاثرات قلمبند کئے۔ مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی کے تینوں زبانوں میں پر درد اشعار اور مختلف مادہ ہائے تاریخ اور مولانا ابوالوفا ثناء اللہ، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، شاہ عین الحق پھلواروی اور مولانا عبدالسلام مبارکپوری کے تاثرات قابل ذکر ہیں۔[3] لیکن طوالت کے خوف سے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

[1] اہلحدیث ۳۰ مارچ ۱۹۱۱ء ص ۴ [2] الامر المبرم ص ۲۱۲ [3] الامر المبرم ص ۲۱۲ و ۲۱۴ و ہفتہ وار اہلحدیث ۳۱ مارچ و ۲۱ و ۲۸ اپریل ۱۹۱۱ء

اولاد

مولانا کے چار لڑکیاں اور ۳ لڑکے تھے، لڑکوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ محمد شعیب۔ یہ بچپن میں پانچ ہی ماہ کی عمر میں انتقال کر گئے تھے۔

۲۔ حکیم ابو عبداللہ محمد ادریس، ۲۰ رجب ۱۲۹۸ھ کو پیدا ہوئے۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا، ان کی چھ اولادوں میں ایک لڑکی اور دو لڑکے ابو محمد عبید اللہ اور عبداللطیف بقید حیات ہیں۔

۳۔ حافظ عبدالفتاح المعروف بہ محمد ایوب۔ بروز یکشنبہ، محرم ۱۳۰۵ھ کو پیدا ہوئے، تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی[1]۔

کتب خانہ

اوپر گزر چکا ہے کہ مولانا کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، چنانچہ ان کا کتبخانہ ہندوستان کے عظیم الشان کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا، یہ مختلف فنون کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں پر مشتمل تھا، فن حدیث کے اتنے عمدہ ذخیرہ سے اس وقت کے اکثر کتب خانے خالی تھے۔ اس کتب خانہ میں مخطوطات اور نادر و نایاب کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا تھا، جو یورپ کے بعض بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی نہیں پایا جاتا تھا[2]۔ بنارس کے ٹاؤن ہال میں ۴ اپریل ۱۹۰۶ء کو ندوۃ العلماء کے زیر اہتمام جن نادر و کمیاب کتابوں کی نمائش کی گئی تھی، ان میں فن حدیث کی بعض نہایت قدیم اور نایاب کتابیں مولانا شمس الحق عظیم آبادی ہی کے کتب خانے سے آئی تھیں، علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے مندرجۂ ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

"مسند عبد بن حمید الکسی۔ مسند ابو عوانہ۔ کشف الاستار عن زوائد مسند البزار للہیثمی، مصنف ابن ابی شیبہ، معرفۃ السنن والآثار للبیہقی، معالم السنن للخطابی،

[1] یادگار گوہری ص ۱۱۲ تا ۱۲۵ [2] اہلحدیث ۲۸ اپریل ۱۹۱۱ء ص ۳ و ۴

شرح سنن ابی داود لابن القیم[1]

ان کے علاوہ صحیح ابن حبان، مسند بزار، مسند حمیدی، مختار مختصر تاریخ بغداد، التمہید لابن عبد البر، شرح الشمائل للترمذی، لمحمد عاشق بن عمر الحنفی۔ تقیید المہمل و تمییز المشکل لابی علی حسین ابن محمد الغسانی، النفس الیمانی۔ الاطراف للمزی، اور النکت الظراف علی الاطراف لابن حجر جیسی سینکڑوں اہم قلمی کتابیں کتب خانے میں موجود تھیں۔ یہ کتب خانہ حضرت مولانا کی عمر بھر کی محنت و جانفشانی کا نتیجہ اور ان کے خداداد شوق علم کا ثمرہ تھا، مولانا ابو القاسم سیف بنارسیؒ اس کتب خانہ کی متعدد کتابوں کے نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں۔

افسوس اور کتابوں کے نام اس وقت یاد نہیں آتے ...... غرض صوبہ بہار میں خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانہ کے بعد جو بانکی پور میں ہے انکا کتب خانہ قابل ذکر تھا، لیکن ذخیرہ حدیث و تفسیر و اسماء الرجال کے لحاظ سے ان کے کتب خانے کا نمبر اول ہے۔[2]

لیکن یہ بیش قیمت کتب خانہ مولانا کی وفات کے بعد باقی نہیں رہا، غالباً اس کی کتابیں ادہر ادھر منتشر ہو گئیں اور دوسرے کتب خانوں میں چلی گئیں بقول مولانا عبید اللہ رحمانی۔

افسوس اب اس کتب خانہ سے علامہ مرحوم کے اخلاف میں سے کوئی فائدہ اٹھانے والا ہے نہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے والا، اناللہ ....[3]"

حالانکہ علامہ کی وفات کے بعد مولانا عبد السلام مبارکپوری مرحوم نے ان کے صاحبزادہ سے کیسی دردمندانہ گذارش کی تھی کہ

[1] الندوہ ج ۳ نمبر ۲ مقالات شبلی ج ۷ ص ۱۱۱ و الحدیث ۳۱ مارچ ۱۹۱۱ء [2] الحدیث ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء [3] سیرۃ البخاری ص ۳۳ (حاشیہ) طبع دوم [4] الحدیث ۲۰ اپریل ۱۹۱۱ء ص ۴

[5] الندوہ جلد ۳ نمبر ۲ مقالات شبلی جلد ۷ ص ۱۱۱ و الحدیث ۳۱ مارچ ۱۹۱۱ء

"میں فاضل لوذعی حکیم محمد ادریس صاحبزادہ سے ملتمس ہوں کہ کتب خانے کے جواہر نادرۃ الوجود اور اعلاق گراں مایہ کی آپ قدر کریں گے، اور کتب خانہ کی فہرست مرتب کرا کر طبع کرا دیں گے کیونکہ علامہ ابو الطیب مرحوم نے بارہا مجھ سے فرمایا تھا، کہ کتب خانہ کی مکمل فہرست تیار نہیں یا میرا ارادہ مصمم ہے کہ جلد فہرست مرتب کرا دوں۔ لیکن کثرت اشغال سے فرصت نہیں ملتی ______ ایک دوسری التماس یہ ہے کہ علامہ ابو الطیب مرحوم نایاب سے نایاب اور قیمتی سے قیمتی قلمی کتابوں کے عاریۃً دینے میں مطلقاً عذر نہ فرماتے اور اس میں بڑی فیاضی سے کام لیتے، جن سے اکثر دھوکا بھی اٹھانا پڑتا۔ لیکن اس میں انھوں نے کبھی بخل سے کام نہ لیا۔ بلکہ وہ شائقین علم کے شائق تھے، بس یہ فیض بھی آپ کا جاری رکھنا بہتر ہے، لیکن اس کے لیے کوئی باضابطہ انتظام کرنا ضروری ہے"[1]

ایسے عظیم الشان اور عمدہ کتب خانہ کا یہ انجام کتنا دردناک ہے۔

تصنیفات

مولانا کو تصنیف و تالیف کا بڑا عمدہ ذوق تھا، کتب حدیث کی شرح و تحقیق اور تصحیح و تعلیق کے علاوہ فقہ و افتا، رجال و تاریخ اور تذکرہ و سیر میں بھی انھوں نے مفید اور بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ان سے ان کے علمی تبحر، جامعیت، وسعت نظر، حدیث و فقہ میں بصیرت، رجال و اسناد اور تاریخ و سیر میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے ذیل میں ان کی تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے۔

۱۔ غایۃ المقصود فی حل سنن ابی داؤد۔ یہ سنن ابی داؤد کی مبسوط اور جامع شرح ہے، لیکن اس کی صرف ایک ہی جلد مطبع انصاری دہلی سے مولانا تلطف حسین عظیم آبادی (متوفی ۱۳۳۴ھ) کے اہتمام میں شائع ہوئی ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ بتیس جلدوں میں

[1] الحدیث امرتسر ۲۰ اپریل ۱۹۱۱ء ص ۲

ہیں[1] لیکن بعض اہل علم نے اسکو مکمل بتایا ہے[2] مولانا عبد السلام مبارکپوری المتوفی ۱۳۴۲ھ تحریر فرماتے ہیں غایۃ المقصود غالبًا دس پاروں تک پہنچی جو بعد ختم تقریبًا عینی شرح بخاری کے برابر پہنچتی[3]، مگر یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ عون المعبود کے آخر میں "فوائد متفرقہ" کے زیر عنوان تحریر کیا گیا ہے۔

ومنها قول ابی داؤد فی باب	ابوداؤد کے قول کو کتاب الجنائز
الامراض المكفرة للذنوب	کے باب الامراض المکفرہ للذنوب
من كتاب الجنائز (.....)	... میں صاحب غایۃ المقصود نے
ذكرا وكلاصاحب الغاية	پہلے اسی طرح ذکر کیا ہے، جس طرح
مثل ماذكر فی هذا الشرح	اس شرح میں ذکر کیا گیا ہے، پھر
... ثم قال فی الغاية ...[4]	وہ غایۃ المقصود میں فرماتے ہیں۔

اس تحریر میں جس باب کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ سنن ابی داؤد کے بیسویں پارے اور عون المعبود کی تیسری جلد میں ہے[5]، اس کے بعد عون المعبود میں کسی اور جگہ غایۃ المقصود کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غایۃ المقصود کی شرح بیس پارے تک مکمل ہو چکی تھی، مگر افسوس کہ شرح کے جو اجزا لکھے جا چکے تھے، وہ بھی ناپید ہیں، اور ان کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا ہوئے؟

مطبوعہ جلد بڑی تقطیع کے ۱۹۷ صفحے پر مشتمل ہے، اس میں ابتدا یعنی کتاب الطہارۃ

---

[1] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات صفحات ۲۰، ۲۷ و ۲۸ [2] تذکرۃ المحدثین (دار المصنفین) ج ۲ ص ۳۱۱ عون المعبود ج ۴ ص ۵۵۵ و ۵۵۶ [3] یادگار گوہری ص ۱۰۹ [4] تذکرہ علمائے حال ص ۱۰۴ نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۸۰، اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ص ۲۱۱، الحیاۃ بعد المماۃ، مقدمہ اتحاف النبیہ فیما یحتاج الیہ المحدث والفقیہ ص ۲۰ [5] اہل حدیث امرتسر مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۱۱ء [6] عون المعبود ج ۴ ص ۵۵۲ و ۵۵۳ [7] عون المعبود ج ۳ ص ۱۴۹

کے ۵۷ ابواب کے تحت درج ۱۸۴ حدیثوں کی شرح و توضیح کی گئی ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے، جو امام ابوداؤد کے حالات وکمالات اور سنن کے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ہے، اس کو سنن ابی داؤد کی مفید اور اہم شرحوں میں خیال کیا جاتا ہے، اور بعض حیثیتوں سے یہ سنن کی اکثر شرحوں سے بہتر ہے، مشہور حنفی عالم اور سنن ابوداؤد کے شارح مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے بھی اس کی اہمیت اور خوبیوں کا اعتراف کیا ہے[1]۔ راقم اس شرح کے متعلق ایک مستقل مضمون ترتیب دے رہا ہے، انشاء اللہ اس میں اس کی اہمیت اور خصوصیات پر مفصل گفتگو کی جائے گی۔

۲۔ عون المعبود علی سنن ابی داؤد | یہ بھی سنن ابی داؤد کی شرح اور در اصل غایۃ المقصود کا خلاصہ ہے، جو چار ضخیم جلدوں میں مطبع انصاری دہلی سے بڑی تقطیع کے تقریبًا ۱۹۰۰ صفحات پر (۱۳۱۸ھ تا ۱۳۲۲ھ) میں شائع ہوئی ہے، عام طور پر ان چاروں جلدوں کو مولانا شمس الحق عظیم آبادی کی تصنیف خیال کیا جاتا ہے۔ جلد ثالث کے خاتمہ اور جلد رابع کے آغاز و اختتام میں اس کی تصریح بھی موجود ہے۔ لیکن پہلی جلد کے خطبہ و خاتمہ اور دوسری جلد کے خاتمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مولانا شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی (م ۱۳۲۶ھ) کی تصنیف ہے، جو مولانا کے چھوٹے بھائی تھے۔ غالبًا اسی بنا پر صاحب بذل المجہود[2]، صاحب معجم المطبوعات العربیہ[3] اور بعض دوسرے حضرات کو التباس ہو گیا ہے اور انھوں نے عون المعبود کو مولانا اشرف کی تصنیف قرار دیا ہے، اس لئے اس مسئلہ کی مختصر تنقیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عون المعبود اصلًا مولانا عظیم آبادی ہی کی شرح ہے، لیکن وہ

---

[1] بذل المجہود ج ۱ ص ۱ [2] ایضًا [3] معجم المطبوعات العربیہ ص ۳۱۰

چاروں جلدوں کے مرتب و مولف نہیں تھے، بلکہ ابتدا کی دونوں جلدوں کو ان کے چھوٹے بھائی مولانا اشرف صاحب نے مرتب کیا تھا، اس کی دو وجہیں ہیں۔

۱۔ پہلے گزر چکا ہے کہ مولانا اشرف نے ان جلدوں کے اندر خود اس کی تصریح کی ہے، اس تصریح کے بعد ان کے بیان کے معتبر نہ ہونے کے کوئی معنی نہیں۔

۲۔ مولانا شمس الحق صاحب کو سنن ابی داؤد کی مفصل شرح لکھتے وقت اس کی ایک مختصر شرح لکھنے کا بھی خیال ہوا، چونکہ وہ دو جلدوں کے بقدر مفصل شرح لکھ چکے تھے، اسلئے تلخیص کا کام جو آسان تھا، اپنے چھوٹے بھائی کے ذمہ کر دیا، اور انھوں نے تن تنہا مولانا کے مشورے اور امداد سے یہ کام انجام دیا، اس لئے ان جلدوں کے مرتب و مولف وہی تھے۔ البتہ اس کے بعد کی مختصر شرح کی ترتیب و تالیف کا کام خود مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے بعض حضرات کے اشتراک سے انجام دیا، کیونکہ اس حصہ کی مفصل شرح نہیں لکھی جا سکی تھی، اس لیے یہ کام مولانا اشرف صاحب انجام نہیں دے سکتے تھے، پس آخر کی دونوں جلدیں مولانا عظیم آبادی ہی کی ترتیب و تالیف کا نتیجہ ہیں۔

ان وجہوں سے راقم کا خیال ہے کہ شروع کی دونوں جلدوں کے جو سولہ[16] پارے پر مشتمل اور غایۃ المقصود کا خلاصہ ہیں، مرتب مولانا اشرف صاحب تھے، اور آخری دونوں جلدیں جو غایۃ المقصود کا خلاصہ نہیں بلکہ مستقل مختصر شرح ہیں، مولانا شمس الحق صاحب کی تالیف کی ہوئی ہیں، رہی یہ بات کہ عون المعبود کے ناشر مولانا تلطف حسین عظیم آبادی اور دوسرے تقریظ نگاروں نے چاروں جلدوں کو مولانا عظیم آبادی ہی کی جانب منسوب کیا ہے، تو غالباً یہ اس بنا پر کہ اصل شارح تو مولانا عظیم آبادی ہی تھے، اور عون المعبود کی ابتدائی دو جلدیں بھی درحقیقت ان ہی کی شرح کی تلخیص ہیں،

اس لیے گویا وہ بھی ان ہی کی کاوش کا نتیجہ ہوئیں۔

اس شرح میں بھی غایۃ المقصود کی اہم خصوصیات آگئی ہیں، دونوں میں محض اجمال و تفصیل کا فرق ہے، اہل فن کا خیال ہے کہ "اس میں سنن ابی داؤد کے اسناد و متون کی مشکلات کو حل کیا گیا ہے اور یہ بیشمار لطیف و دقیق مسائل و مباحث کا مجموعہ نادر تحقیقات اور علمی نکات پر مشتمل ہے، اور مختصر ہونے کے باوجود مفید مطلب ہے۔"[1] علامہ محمد منیر دمشقی تحریر فرماتے ہیں۔

کل من جاء بعدہ من	مصنف کے بعد کے ہند و بیرون
شیوخ الھند وغیرہ	ہند کے علما نے اس شرح سے استفادہ
استمد وا من شرحہ[2]	کیا۔

اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ساتھ سنن ابی داؤد کا صحیح ترین متن بھی شامل کیا گیا ہے،

یہ شرح ہندوستان کے علاوہ لبنان اور سعودی عربیہ سے بھی شائع ہوئی ہے، سعودی عربیہ کا ایڈیشن نہایت عمدہ ہے، یہ متوسط سائز کی چودہ[14] جلدوں میں علامہ عبدالرحمن محمد عثمان کی تعلیقات کے ساتھ مصری ٹائپ پر ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں چھپا ہے، اس میں متن پر اعراب بھی ہے، اور ہر ہر باب کی حدیثوں پر ہندسہ کا نمبر بھی دیا گیا ہے۔

۳۔ التعلیق المغنی علی سنن الدارقطنی،	مولانا عظیم آبادی کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلی دفعہ حدیث کی عظیم الشان کتاب سنن دارقطنی کا متن اپنی مفید

[1] ملاحظہ ہوں تقریظات عون المعبود ج ۴ [2] انموذج من الاعمال الخیریۃ ص ۶۲۰

تعلیقات کے ساتھ شائع کیا، متن کی ترتیب تین قلمی نسخوں کی مدد سے کی گئی ہے، ان کے حواشی و تعلیقات کی نوعیت کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہوتا ہے

اکتفی فیھا علی تنقید بعض احادیثہ وبیان علل وکشف بعض مطالبہ علی سبیل الایجاز والاختصار۔[1]	میں اس میں بعض حدیثوں پر تنقید کرکے ان کی علتیں بیان کروں گا اور مختصراً بعض کے مطالب بھی واضح کروں گا۔

اس کے مقدمہ میں امام دارقطنی اور ان کی سنن کے متعلق مفید معلومات تحریر کئے گئے ہیں یہ کتاب بڑی تقطیع کی دو جلدوں میں مطبع فاروقی دہلی سے پہلی بار ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوئی، اس کا ایک اور اڈیشن بلاد عربیہ سے بھی شائع ہوا ہے، مگر وہ راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

۴۔ رفع الالتباس عن بعض الناس | ۴۳ صفحے کا یہ رسالہ ۱۳۱۱ھ میں بڑی تقطیع پر مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوا تھا، بعض لوگوں نے غلطی سے اس کو مولانا محمد اسماعیل علی گڈھی (م ۱۳۱۱ھ)[2] اور بعض نے مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ)[3] کی تصنیف قرار دیا ہے۔

یہ رسالہ "بعض الناس فی دفع الوسواس" کے جو حنفیہ پر امام بخاریؒ کے اعتراضات کو غلط ثابت کرنے کے لیے لکھا گیا تھا، جواب میں ہے۔ لیکن اس میں جماعتی عصبیت سے کام نہیں لیا گیا ہے، اور امام اعظم کے فضل و کمال کا نہایت فراخ دلی سے اعتراف کیا گیا ہے، اس کے دو اڈیشن پہلے چھپ چکے ہیں اور عنقریب تیسرا اڈیشن مرکزی دارالعلوم

---

[1] التعلیق المغنی ج ۱ ص ۲ [2] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۳۴ و تراجم علمائے حدیث ہند ج ۱ ص ۲۰۰ [3] مقدمہ انوار الباری ج ۲ ص ۲۲۹ (طبع دوم)

بنارس سے شائع ہونے والا ہے،

۵۔ اعلام اہل العصر باحکام رکعتی الفجر | مطبع انصاری دہلی نے ۱۳۰۵ھ میں بڑی تقطیع کے ۲۷۶ صفحات پر اس کو شائع کیا تھا، موضوع نام سے ظاہر ہے، اکثر اہل علم نے اعتراف کیا ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی رسالہ نہیں لکھا گیا ہے، معلوم ہوا ہے کہ ادارۂ علوم اثریہ لائلپور (پاکستان) نے تخریج و حواشی کے ساتھ بہترین ٹائپ میں اسکو دوبارہ شائع کیا ہے،

۶۔ المکتوب اللطیف الی المحدث الشریف | مولانا نے میاں صاحب محدث دہلویؒ کو مکہ معظمہ سے ۱۳۱۲ھ میں ایک طویل خط لکھکر بعض سوالات دریافت کئے تھے، اس رسالہ میں مولانا کے مکتوب گرامی کے ساتھ میاں صاحب کا جوابی خط بھی آگیا ہے جو ۶ رسالوں کے ایک مجموعہ کے ساتھ مطبع انصاری دہلی سے ۱۳۱۴ھ میں شائع ہوا ہے۔

۷۔ القول المحقق۔ | یہ چھ صفحے کا فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ ہے، اور اعلام اہل العصر کے ساتھ چھپ چکا ہے مؤلف نے اس میں مندرجۂ ذیل سوال کا مفصل جواب تحریر کیا ہے کہ

جانوران ماکول اللحم را خصی کردن جہت تطییب لحم جائز است یا نہ؟	جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے کیا ان کے گوشت کو فربہ اور عمدہ بنانے کے خیال سے ان کو خصی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

یہ رسالہ اس موضوع کی احادیث و آثار، متقدمین و متاخرین کے اقوال اور

مفید حدیثی معلومات کا مجموعہ ہے،

۸۔ **عقود الجمان فی جواز تعلیم الکتابۃ للنسوان** ،۱ یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں لکھا گیا تھا، لیکن راقم کے پیش نظر اس کا عربی ترجمہ ہے جو علامہ محمد بن عبد العزیز بن مانع کی تعلیقات کے ساتھ ٹائپ پر ۱۹۶۱ء میں دمشق سے شائع ہوا ہے، مصنف نے اس میں حدیثوں کی روشنی میں عورتوں کے تحریر و کتابت سیکھنے کو جائز قرار دیا ہے،

۹۔ **الاقوال الصحیحۃ فی احکام النسکیۃ** اس کی تاریخ تصنیف "عجیب غریب" ۱۲۹۴ھ سے نکلتی ہے، اس میں عقیقہ کی سنیت اور ولادت کے وقت اذان دینے کے علاوہ اس امر پر بھی بحث کی گئی ہے کہ بچہ کا نام کس دن رکھنا افضل ہے، ۱۲۹۷ھ میں مطبع فاروقی دہلی نے اس کو شائع کیا تھا۔

۱۰۔ **غنیۃ الالمعی** یہ مختصر عربی رسالہ "المعجم الصغیر للطبرانی" کے ساتھ مطبع انصاری دہلی سے شائع ہو چکا ہے، اس میں بعض حدیثی اور فقہی امور و مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

۱۱۔ **تعلیقات علی اسعاف المبطا برجال الموطا**، رجال موطا پر علامہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی مشہور کتاب اسعاف المبطا پر مولانا کی مختصر مفید تعلیق ہے، اس میں سیوطی کے بیان پر اضافے بھی کئے گئے ہیں اور کہیں کہیں ان کی غلطیوں پر تنبیہ بھی کی گئی ہے۔ مولانا عظیم آبادی نے سیوطی کے کمیاب رسالہ کو متعدد نسخوں کے مقابلہ و تصحیح کے بعد اپنی تعلیقات کے ساتھ ۱۳۲۰ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع کیا تھا۔

۱۲۔ **الکلام المبین فی الجہر بالتامین** یہ رسالہ محمد علی صاحب وکیل مرزاپوری کے رسالہ "القول المتین فی اخفاء التامین" کے جواب میں اردو میں لکھا گیا تھا، اور ۱۳۰۳ھ میں مطبع انصاری دہلی سے متوسط سائز کے ۴۴ صفحات پر شائع ہوا تھا۔

۱۳۔ **التحقیقات العلی باثبات فرضیۃ الجمعۃ فی القری** یہ رسالہ بھی اردو میں ہے اور ۱۳۰۹ھ میں مطبع احمدی پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔

۱۴۔ **ہدایۃ النجدین الی حکم المعانقۃ والمصافحۃ بعد العیدین** یہ رسالہ ایک استفتا کا جواب ہے جو مولانا کی وفات کے بعد شائع ہوا تھا مگر راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

۱۵۔ **رسالہ در رد تعزیہ** یہ اردو میں لکھا گیا تھا۔ اور چھپ بھی چکا ہے لیکن راقم کو دستیاب نہیں ہو سکا۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ مولانا کی متعدد کتابیں اور رسالے غیر مطبوعہ بھی ہیں، اوپر غایۃ المقصود کی غیر مطبوعہ جلدوں کا ذکر کیا جا چکا ہے، مزید غیر مطبوعہ کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

۱۶ **فضل الباری شرح ثلاثیات البخاری** شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی مبارکپوری لکھتے ہیں۔

افسوس ہے کہ علامہ اس شرح کو اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکے (سیرۃ البخاری ص ۴۴۲ حاشیہ)

۱۷۔ **النجم الوہاج فی شرح مقدمہ مسلم بن الحجاج** جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ مقدمہ امام مسلم کی مبسوط شرح ہے۔

۱۸۔ **ہدیۃ اللوذعی بنکات الترمذی** یہ ترمذی کے اسناد و متون کے متعلق معلومات پر مشتمل ہے، لیکن مصنف اسکو مکمل نہیں کر سکے تھے،[1]

۱۹۔ **تعلیقات علی سنن النسائی** اس میں سنن نسائی کے بعض مشکلات کو حل کیا گیا ہے۔

۲۰۔ **نخبۃ التواریخ** اس میں مولانا نے قدیم و جدید علما کے سوانح اور کارنامے فارسی

---

[1] سیرۃ البخاری ص ۴۲۸

زبان میں لکھے تھے، نزہۃ الخواطر اور تذکرہ علمائے حال کے مصنفین نے اس سے استفادہ کیا ہے، الحیاۃ بعد المماۃ میں میاں نصاب کے جو حالات درج کئے گئے ہیں وہ اسی سے منقول ہیں۔

۲۱۔ تذکرۃ النبلاء فی تراجم العلماء | یہ بھی فارسی میں ہے[1]، اور متعدد کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں، غالباً مصنف نے یہ دونوں کتابیں مولانا حکیم سید عبد الحیؒ حسنی کو نزہۃ الخواطر کی جمع و تالیف کے سلسلہ میں دیدیا تھا اسلئے اسمیں جا بجا ان کے حوالے ملتے ہیں خصوصاً آخری دونوں جلدوں میں۔

۲۲۔ نہایۃ الرسوخ فی معجم الشیوخ | یہ کتاب عربی میں تھی، اس میں اپنے اساتذہ اور سلسلۂ اسناد کے شیوخ کے حالات تحریر کئے ہیں۔

۲۳۔ تفریح المتذکرین بذکر کتب المتاخرین | یہ اہم کتاب فارسی میں تھی[2] مولوی ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے غلطی سے اس کو عربی میں بتایا ہے[3]۔ غالباً مولانا عبد الحیؒ حسنی کی کتاب الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کا ایک ماخذ یہ کتاب بھی تھی۔

۲۴۔ النور اللامع فی اخبار صلوٰۃ الجمعۃ عن النبی الشافع | موضوع نام سے ظاہر ہے اسکی زبان عربی تھی۔

۲۵۔ تحفۃ المتہجدین الابرار فی اخبار صلوٰۃ الوتر و قیام رمضان النبی المختار۔ | اس میں وتر اور قیام رمضان کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں اسکی زبان بھی عربی تھی۔

۲۶۔ تنقیح المسائل | یہ فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

۲۷۔ فتویٰ فوٹوگرافی۔
۲۸۔ مسائل ستین۔
۲۹۔ فیض ابتدائی۔
} مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے ان رسالوں کی زبان فارسی بتائی ہے[4]۔

[1] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۰۰ [2] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۹، [3] یادگار گوہری ص
[4] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۵۸ [5] ایضاً ص ۶۰

ہندوستان کے ایک قدیم صاحب دیوان صوفی شاعر

جناب لطاف حسین خاں صاحب شروانی۔ اسلامیہ کالج اٹاوہ

ہندوستان کے صوفیاے کرام میں حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ سلسلۂ چشتیہ کے بڑے نامور بزرگ ہیں، یہ حضرت شیخ بابا فرید الدین گنج شکرؒ (۱۱۷۵ء تا ۱۲۶۵ء) کے بڑے محبوب اور عزیز خلیفہ تھے، کہا جاتا ہے کہ فارسی زبان میں یہ ہندوستان کے پہلے صاحب دیوان صوفی شاعر ہیں شیخ جمال الدین ہانسویؒ ابتدا میں خطیب کے عہدے پر مامور تھے[1]، بعد میں حضرت بابا فریدؒ کے مرید ہو گئے اور دنیا کی تمام آلائشوں سے دستکش ہو گئے، اُن کا سلسلۂ طریقت حسب ذیل ہے:

[1] مراۃ الکاملین (مخطوطہ ذاتی کلکشن) مصنفہ عباد اللہ خواجہ عنایت اللہ کالپوی میں لکھا ہے کہ وہ ابتدا میں فتویٰ دیا کرتے تھے، بعد میں حضرت بابا صاحب کے مرید ہو گئے، ص ۹۲ لیکن پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے ہانسی کا خطیب لکھا ہے، دیکھئے:

The life and Timeo of Shaikh Erid udin gang Shaker

گلزار ابرار میں محمد غوثی لکھتے ہیں، کہ وہ حنفی الاصل ہیں، ص ۴۵۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر

- مخدوم علاء الدین صابر کلیریؒ — سلسلۂ صابریہ
- شیخ نظام الدین اولیاؒ — سلسلۂ نظامیہ
  - شیخ قطب الدین منورؒ
  - شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ
- شیخ جمال الدین ہانسویؒ — سلسلۂ جمالیہ
  - مولانا برہان الدینؒ (شیخ جمال الدینؒ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے کو خلافت نامہ ملا)
  - (نبیرۂ شیخ جمال الدین ہانسویؒ)

شیخ جمال الدینؒ حضرت بابا فریدؒ کے سب سے پرانے مرید ہیں[1]، اسی لئے حضرت بابا فریدؒ اُن سے خاص انسیت رکھتے تھے، جس کا اظہار بھی اکثر ہوتا رہتا تھا، ایک مرتبہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے حضرت بابا فریدؒ کو تحریر فرمایا، کہ آپ میرے تمام مریدوں اور خلفاء کو لے لیجئے اور اس کے بدلہ میں مجھے شیخ جمال الدین ہانسوی کو دیدیجئے، حضرت بابا فریدؒ نے جواب میں لکھا کہ جمال میرا جمال ہے، معاوضہ مال میں ہو سکتا ہے، نہ کہ جمال میں[2]" حضرت بابا فریدؒ کے تذکرہ میں مولانا جمالی لکھتے ہیں :۔

نقل است از حضرت سلطان	حضرت سلطان الاولیا نظام الدین
الاولیاء المشائخ نظام الملۃ والدین	رحمۃ اللہ سے منقول ہے کہ میں جس زمانہ

---

[1] حضرت بابا فریدؒ کے حسب ذیل خلیفہ تھے،
(۱) شیخ نجیب الدین متوکلؒ (۲) مولانا بدر الدین اسحاقؒ (۳) شیخ جمال الدین ہانسویؒ (۴) شیخ نظام الدین اولیاءؒ (۵) شیخ عارفؒ (۶) شیخ علی صابرؒ (۷) مولانا فخر الدین صفاہانی، رحمۃ اللہ علیہ،

[2] گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۵۴، [3] سیر العارفین، ص ۴۹،

قدس سرہ در ایامیکہ من بحضرت	میں قصبہ اجودھن میں حضرت شیخ
ایشان در قصبہ اجودھن بودم	فرید صاحب کی خدمت میں حاضر
اندام مبارک ایشاں را نکسری	تھا، اسی زمانہ میں حضرت کو سخت
صعب واقع شدہ چنانچہ مرا و	بیماری لاحق تھی، انھوں نے مجھے
مولانا جمال الدین ہانسوی را و	اور مولانا جمال الدین ہانسوی، اور
مولانا بدر الدین اسحاق را و درویش	مولانا بدر الدین اسحٰق اور درویش
علی بہاری را اشارت فرمود کہ	علی بہاری کو حکم دیا کہ فلاں قبرستان
بروید از برائے صحت من در فلاں	میں جاکر تم لوگ میری صحت کے
گورستان مشغول باشید، بحکم اشارت	لئے دعا کرو، اُن کے ارشاد کے مطابق
حضرت ایشاں بگورستانیکہ فرمودہ	ہم سب لوگ اس قبرستان میں جس میں
بودند رفتیم، و شب آنجا مشغول	جانے کا آپ نے حکم دیا تھا، جاکر
شدیم[1]"	رات بھر دعا میں مشغول رہے،

وہ حضرت بابا صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے، اپنے وطن ہانسی سے سات بار اجودھن تشریف لائے، اور حضرت بابا فرید بارہ سال ان ہی کی خاطر ہانسی میں مقیم رہے[2]، ایک موقع کے اجتماع کا تذکرہ مولانا جمالی کرتے ہیں،

نقل است (از حضرت نظام الدین	حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ سے
اولیا) کہ حضرت وقت نیم روزے	سے منقول ہے کہ ایک روز حضرت شیخ
از خانہ بیروں آمد ما و مولانا بدر الدین	فرید الدینؒ دوپہر کے وقت گھر سے باہر نکلے،

---

[1] سیر العارفین ص ۴۹ - [2] گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۵۴،

اسحاق و مولانا جمال الدین ہانسوی	میں اور مولانا بدر الدین اسحاق اور
حاضر بودیم، حضرت شیخ در سایہ	مولانا جلال الدین ہانسوی حاضر تھے،
دیوار استادہ[1]"	اور حضرت شیخ دیوار کے سایہ میں
	کھڑے تھے،

اسی تعلق اور صحبت کا اثر تھا کہ شیخ جمال الدین ہانسوی صدق وصفا میں کمال کو پہنچ گئے تھے، محمد غوثی لکھتے ہیں،

"چونکہ طریقت اور حقیقت کا جمال اور جمال کی چمک دمک آپ کے حالات سے عیاں تھی، لہذا پیر کی قلبی اور نظری توجہ کے اثر سے آپ کا صدق وصفا حد کمال کو پہنچ گیا تھا[2]"

انہی حالات کے تحت بابا فرید کو حکم تھا، کہ ان کے ہر خلافت نامہ کی تصدیق شیخ جمال الدین کریں[3]، اگر شیخ جمال الدین کسی کے اجازت نامہ کو چاک کر دیتے، تو حضرت بابا فرید فرماتے، کہ جمال کے چاک کئے ہوئے کو فرید نہیں سی سکتا[4]

ان باتوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے. کہ شیخ جمال الدین کا مرتبہ حضرت بابا فرید کی نظر میں کتنا بلند تھا، اُن کی بزرگی کے بہت سے اشارے حضرت بابا فرید سے ملتے ہیں، مثلاً مولانا جمالی لکھتے ہیں کہ بحکم شیخ ایک بچہ اینٹ اٹھا کر لایا تاکہ اس پر بیٹھ سکیں، مولانا نظام الدین اور مولانا جمال الدین ہانسوی اور مولانا بدر الدین کے لئے پوری اینٹ لانے کا حکم تھا، جب کہ وہ بچہ ایک تیسرے صاحب کے لئے جن کا نام

[1] سیر العارفین ص ۵۷ - [2] گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۵۲،
[3] سیر الاولیاء ص ۱۷۹، ۱۸۰، [4] ایضاً ص ۱۷۹،

یوسف تھا، آدھی سے بھی چھوٹی اینٹ لایا[1]

"سیر الاولیاء" کے مؤلف لکھتے ہیں، کہ بابا فرید نے شیخ جمال الدین ہانسوی کو عوارف المعارف کا ایک نسخہ بھی عطا کیا تھا، جو بعد میں شیخ نظام الدین اولیاء کے پاس آیا، اور پھر شیخ نظام الدین اولیاء نے یہ نسخہ شیخ قطب الدین منور کو دے دیا[2]،

جب شیخ نظام الدین اولیاء بیعت ہوئے تو ان ایام میں حضرت بابا فرید کے یہاں اکثر فاقہ رہتا تھا، حضرت بابا فرید کی خدمت جن حضرات کے سپرد تھی، اُن میں شیخ جمال الدین ہانسوی پیش پیش تھے، شیخ جمالی شیخ نظام الدین اولیاء کی زبانی بیان فرماتے ہیں:-

" خدمت شیخ المشائخ جمال الدین	حضرت شیخ المشائخ بابا فرید گنج
ہانسوی از جنگل دیلہ کہ بری از درخت	کی خدمت میں شیخ جمال الدین جنگل سے
کریز حاصل می شود واکثر مردم ازا	دیلہ لایا کرتے تھے، یہ ایک قسم کا پھل ہے جو کریل
در سرکہ می اندازند، و اچاری سازند	کے درخت سے حاصل ہوتا ہے اور اکثر لوگ اسکو
آوردی و مولانا حسام الدین کابلی	سرکہ میں ڈالکر اچار بناتے ہیں اور مولانا حسام
آب می آوردی و دیگہائے مطبخ شستے	الدین کابلی پانی بھر کر لاتے تھے، اور
و من آن دیلہائے جنگل می پختمی در کا	باورچی خانہ کے دیگ اور برتن دھویا
دکچکول انداختہ از جہت افطار	کرتے تھے، اور میں ان جنگلی دیلوں کو پکاتا
حضرت شیخ الاسلام	تھا، اور اُن کو پیالوں میں رکھکر حضرت شیخ
وحضار مجلس می بردی و پیش ایشان	الاسلام اور حاضرین مجلس کے افطار کیلئے
بنہادی وآن طعام مذکور را گاہے	لیجاتا تھا، اور اُن کے سامنے پیش کرتا تھا،

[1] سیر العارفین، ص ۵۸ - [2] سیر الاولیاء، ص ۲۴۹، ۲۵۰،

نمک میسّر شدے و گاہے	اور اس کھانے کے لئے کبھی نمک میسّر ہوتا
نبودے[۴۸]	تھا، اور کبھی نہیں ہوتا تھا،

شیخ نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں کہ حضرت بابا فریدؒ نے اپنے دستِ خاص سے مجھے اجازت نامہ اور خلعت عطا کی، اور ارشاد فرمایا، کہ ہانسی میں مولانا جمال الدین کو اور دہلی میں "قاضی منتخب کو دکھا دینا، جب حضرت بابا فریدؒ کے فرمان کے مطابق میں ہانسی پہونچا، اور جمال الدین کو اجازت نامہ دکھایا، تو وہ بہت خوش ہوئے، اور یہ بیت پڑھی ؎

خدائے جہاں را فراواں سپاس | کہ گوہر سپردہ بہ گوہر شناس

اور چند روز مہمان رکھ کر رخصت کیا[۴۹]

ایک مرتبہ شیخ نظام الدین اولیا، اجودھن جاتے ہوئے ہانسی میں شیخ جمال الدین کے یہاں مقیم ہوئے، شیخ جمال الدین نے اپنی عسرت اور غربت کی اطلاع حضرت بابا فرید کو شیخ نظام الدین اولیا، کی معرفت بھیجی، حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا،

"او را بگو چوں ولایت کسی دادہ	اُن سے کہو جب ولایت کسی شخص
شود او را واجب است استعمالش"[۵۰]	کو عطا کی جاتی ہے تو اس کے لئے
اس کا استعمال واجب ہو جاتا ہے،

حضرت بابا فریدؒ شیخ جمال الدین کے متعلق فکر مند رہتے تھے، اور ان کی حالت معلوم کرتے رہتے تھے، حضرت بابا فریدؒ کو ایک مرتبہ اطلاع ملی کہ شیخ جمال الدین نے اپنی تمام جائداد

---

۴۸ سیر العارفین، ص ۶۲-۶۱۔ ۴۹ دررِ نظامی، ص ۱۲۷،

۵۰ سیر الاولیا، ص ۱۸۰،

چھوڑ دی، اور عہدہ سے دستبردار ہوگئے، اور ضعف و فاقہ میں مبتلا رہیں، تو اُن کے صبر و ضبط سے بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ جمال خوش ہے[۵۱]

ایک موقع پر شیخ نظام الدین اولیا، نے فرمایا کہ ایک دفعہ شیخ جمال الدین اور خواجہ شمس الدین دبیر اور دوسرے دوستوں کے ساتھ حضرت پیر مرشدؒ کی خدمت سے رخصت ہونے کا موقع ملا، تو شیخ جمال الدین نے حضرت شیخ سے وصیت کی درخواست کی، حضرت شیخ نے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا، کہ اس کو خوش رکھنا، چنانچہ شیخ جمال الدین اس وصیت کی وجہ سے مجھ پر بہت مہربان رہے، سفر میں چونکہ خواجہ شمس الدین دبیر معدنِ لطافت اور کانِ ظرافت ساتھ تھے، اس لئے ہم بہت خوش رہے، ہم لوگ موضع اگروہ کے قریب پہونچے، یہاں کا حاکم شیخ جمال الدین کا شناسا تھا، اس لئے اُس نے ہم سب کو اپنا مہمان بنا کر رکھا، شیخ جمال الدین نے جب اجازت چاہی تو اُس نے کہا کہ اس وقت اجازت دوں گا جب آپ کی دعا سے یہاں بارش ہوگی، کیونکہ یہاں بارش نہ ہونے سے قحط کا سا حال ہے، شیخ جمال الدین نے زبان سے کچھ نہ کہا، مگر دل سے توجہ فرمائی، چنانچہ رات کو اس قدر بارش ہوئی کہ تمام علاقہ سیراب ہوگیا، اس سفر میں جب ہم ایک دوراہے پر پہونچے جہاں سے ایک راستہ سامانہ کو جاتا تھا، تو شیخ جمال الدین ہم لوگوں سے رخصت ہوئے، اور یہ شعر پڑھا،

یار قدیم راستی می بردی | داد تو مقیم راستی می بردی[۵۲]

فوائد الفواد میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس موقع پر ہم سب پر ایک خاص اثر بارحت ہوا[۵۳] ملفوظات میں درج ہے کہ شیخ نظام الدین اولیا، نے فرمایا، کہ ایک دفعہ صبح کے وقت

---

۵۱ سیر الاولیا، ص ۱۸۰ و ۱۸۱، ۵۲ دررِ نظامی۔ ص ۱۵۳-۱۵۴،

۵۳ فوائد الفواد (ترجمہ) ص ۲۷۰،

ہانسی میں شیخ جمال الدین کا مہمان تھا، سردی کے ایام تھے، شیخ جمال الدین نے مجھ سے فرمایا،

بار وغن گاؤ اندریں روزے خنک
نیکو باشد ہریسہ ونان تنک

میں نے کہا ذکر الغائب غیبۃ (غائب کا ذکر غیبت ہے) شیخ جمال الدین نے فرمایا،
غائب نہیں میں نے اُس کو حاضر کرلیا ہے، پھر دسترخوان بچھایا گیا[51]

وفات | شیخ نظام الدین اولیا نے فرمایا کہ حضرت پیر مرشد کی زیارت کی غرض سے اجودھن جاتے ہوئے ہانسی پہونچا، تو شیخ جمال الدین بیمار تھے، اور میری موجودگی ہی میں شیخ جمال الدین کی وفات ہوئی، مراۃ الکاملین کا مصنف لکھتا ہے، کہ ۱۲ شعبان کو وفات ہوئی، اور ہانسی میں دفن ہوئے[52]

اولاد | مولانا جمال الدین ہانسوی کی وفات کے وقت اُن کی اولاد میں مولانا برہان الدین بہت چھوٹے تھے، حضرت بابا فرید نے اُن کو خلافت عطا فرمائی، اور فرمایا، تم کو وہ تمام اختیارات دیئے جاتے ہیں، جو تمہارے باپ کے تھے[53] محمد غوثی مولانا برہان الدین کے متعلق فرماتے ہیں:-

"آپ صاحب حال وقال تھے، اور علم وحجت وبرہان بھی جانتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب پدر بزرگوار کے ناسوتی جہان سے کوچ فرمانے کا وقت آیا تو اُن کی کنیز جو اپنے وقت کی عارفہ اور عابدہ تھیں، اور جنکو حضرت گنج شکرؒ مادر مومنان فرمایا کرتے تھے، جو خرقہ اور عصا پدر بزرگوار کو حضرت گنج شکرؒ نے عطا فرمایا تھا، سامنے لے آئیں، ارشاد ہوا برہان الدین کو دیدیا، جواب میں عرض کیا ابھی خورد سال ہے، ارشاد ہوا کچھ مضائقہ نہیں، ماہ نو ہے، جلد بدر ہو جائے گا، اور فرمایا کہ

۵۱ دُرر نظامی ص ۱۹۲، ۵۲ مراۃ الکاملین (مخطوطہ) ص ۱۹۲
۵۳ گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۱۸۳، ۱۸۲،

جب اس کا زمانہ ہوش آجائے تو اس کو چاہئے کہ سلطان الاولیا کی خدمت کرے تاکہ ان کی خدمت سے دوجہاں کے کمالات حاصل ہوں"[54]

حضرت سلطان الاولیا کی زندگی میں شیخ برہان الدین نے کبھی کسی کو مرید نہیں کیا، وہ فرماتے تھے کہ شیخ نظام الدین کے ہوتے ہوئے مجھے زیب نہیں دیتا، اُن کو شیخ نظام الدین اولیا سے بڑی عقیدت تھی، شیخ جمال الدینؒ کے دوسرے بڑے صاحبزادے مجذوب تھے، لیکن کبھی کبھی یہ بڑی عقلمندی کی گفتگو کرتے تھے،

شیخ برہان الدینؒ کے صاحبزادے شیخ قطب الدین منوّر اپنے وقت کے بڑے مشہور بزرگ گذرے ہیں، یہ شیخ نظام الدین اولیا کے مشہور خلیفہ ہیں، شیخ منوّر محمد بن تغلق کے عہد کے مشہور بزرگ ہیں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اور شیخ شمس الدین یحییٰ بھی اس عہد میں تھے، ان بزرگوں نے سلسلۂ چشتیہ کی بڑی خدمت کی ہے، مورخ شمس سراج عفیف شیخ منوّر کا مرید تھا،[55]

گلزار ابرار کا مؤلف لکھتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق نے قاضی کمال الدین صدر جہاں کی معرفت چند دیہ کا فرمان شیخ منوّرؒ کے نام کرکے آپ کے پاس بھیجا، آپ نے لانے والے سے فرمایا، "میں نے سُنا ہے کہ سلطان نصیر الدین جن ایام میں اوچہ اور ملتان گیا ہوا تھا، تو اُس نے بھی اسی طرح کا فرمان امیر غیاث الدین سپہ سالار کے ہاتھوں حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں اجودھن بھیجا تھا، لیکن انھوں نے یہ کہکر واپس کر دیا تھا، کہ ہمارے بزرگوں نے بادشاہوں سے کچھ قبول نہیں کیا، شیخ منوّر کے اس فرمانے پر فرمان لانے والا واپس چلا گیا،[56]

سلطان فیروز شاہ تغلق سے ہانسی میں شیخ منوّر کی ملاقات کا واقعہ شمس سراج عفیف نے

۵۴ گلزار ابرار ترجمہ ص (۱۰۸) ۵۵ سیر الاولیا، ص ۱۸۴، دُرر نظامی ص ۳۵، ۳۶
۵۶ برہان، جولائی ۱۹۶۶ء ع ص ۷، ۵۷ گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۹۶،

اس طرح لکھا ہے :-

روز جمعہ بود حضرت فیروز شاہ پیش
از نماز جمعہ برائے ملاقات خدمت شیخ
الاسلام شیخ قطب الدین قدس اللہ
سرہ العزیز قصد نمودہ درون حصار
درآمدہ درآں وقت خدمت شیخ
برائے نماز جمعہ از خانقاہ بیروں آمدہ
بودند، و پیش در خویش ایستادہ شدہ
بودند، کہ سلطان فیروز رسید، و درآں
وقت خدمت شیخ جبہ خدمت شیخ جمال الدین ہانسویؒ
پوشیدہ بودند، بر قانون معتاد جد
بزرگوار خود، و ایں جبہ کہنہ سالہا بود،
المقصود حضرت فیروز شاہ برائے
ملاقات خدمت شیخ منور رفت
و خان اعظم تاتار خاں طالب رضائے
رضائے جہان برابر بود، ہر دو بزرگوار
بعادت حضرت پروردگار مصافحہ
کردند"[۵۰]

جمعہ کے روز فیروز شاہ نے شیخ
الاسلام قطب الدین قدس سرہ سے
ملاقات کرنے کا ارادہ کیا، اور حصار
میں داخل ہوا، اس وقت حضرت شیخ
نماز جمعہ کے لئے خانقاہ سے باہر تشریف
لائے تھے، اور اپنی خانقاہ کے دروازے
پر کھڑے تھے کہ فیروز شاہ پہنچ گیا،
حضرت شیخ اس وقت اپنے جد امجد
شیخ جمال الدین ہانسوی کا جبہ مبارک
زیب تن فرمائے ہوئے تھے، انہی کی
شان الوت میں جلوہ نما تھے، یہ جبہ
نہایت پرانا ہوگیا تھا، مختصر یہ کہ
فیروز شاہ حضرت قطب الدین کی
ملاقات کو حاضر ہوا، خان اعظم تاتار
خاں بھی ان کے ہمرکاب تھا، دونوں
نے حضرت شیخ سے مصافحہ کیا،

۵۰ تاریخ فیروز شاہی ص ۷۸، ۷۹، نیز دیکھئے ص ۸۱، ۸۲، ۸۵،

شیخ منور کی قبر ہانسی کے میدان میں ایک گنبد کے نیچے ہے، جس کو اب "اقطاب اربعہ" کہتے ہیں اور یہیں شیخ جمال الدینؒ شیخ برہان الدین اور شیخ نورؒ بھی آرام فرما ہیں،[۵۱]

شیخ جمال الدین ہانسوی کے چند کلمات

محمد غوثی نے شیخ جمال الدینؒ، شیخ برہان الدینؒ کے سراپا نصیحت کلمات گلزارِ ابرار میں درج کئے ہیں،

"گفتار بے کردار زیب نہیں دیتی، جس کی سی رفتار تم نہ چل سکو اس کی گفتار چھوڑ دو کیونکہ ایسی گفتار بالکل غیر موثر ہوتی ہے"[۵۲]

تصانیف،

شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی صرف دو تصانیف دستیاب ہوتی ہیں،

۱- فارسی دیوان - یہ دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد میں تصوف سے متعلق مختلف موضوعات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے، زندگی کے مختلف ادوار پر گفت گو کی ہے اور سلطان شمس الدین التمش کا مرثیہ لکھا ہے،

دوسری جلد میں قطعات اور رُباعیات وغیرہ ملتی ہیں، یہ دونوں دیوان چشمۂ فیض دہلی میں پیرجی رفیع الدین تحصیلدار دہلوی کی معرفت ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئے تھے، مگر اب نایاب ہیں، ان مطبوعہ نسخوں کا سراغ صرف دو جگہ ملا ہے، ایک پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ذاتی گلشن میں، اور دوسرے ندوۃ العلما، لکھنؤ کے کتب خانہ میں جہاں غلطی سے دیوان قطب جمال کے نام سے درج تھا لیکن اب میری نشاندہی پر اسے درست کر دیا گیا ہے:

۲- دوسری تصنیف عربی میں ملہمات کے نام سے ہے، جس میں تصوف کے نکات بڑے عمدہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں، ملہمات بھی ۱۳۰۶ھ میں یوسفی پریس الور سے شائع ہو چکی ہے،

نمونۂ کلام

دیوان اوّل کے چند شعر ملاحظہ ہوں،

۵۱ گلزار ابرار (ترجمہ) ص ۹۶ - ۵۲ ایضاً ص ۵۴،

ہمہ خواریست اندر عشق بازی   چرا جوئی تو عزت خوار می باش

اگر بر دارے نیش بار دارے   سپرده پائے اندر غار می باش

بیک سوے افگن ازره خار نفت   پس اندر مسکن گلزار می باش

وصال یار نبود خفتگان را   برائے وصل او بیدار می باش

جمالا گر بہ بینی یا نہ بینی   ہمیشہ طالب دیدار می باش[47]

———.———

می نیابم وصل روح افزائے تو   زرد و لاغر از غم آں گشتہ ام

تا مگر از حال دربان بر رسی   چوں جمال خستہ درباں گشتہ ام[48]

———.———

دانم کہ وصال چو تو سلطاں   شایستہ ہر گدا نباشد

لیکن چو امید من بوصلت   در نومیدے رضا نباشد

مقصود جمال خستہ انت   کز حضرت تو جدا نباشد[49]

پیری کے بیان میں فرماتے ہیں :-

جوانی رفت و پیری اندر آمد   بیاضی از سواد من بر آمد

مگر صبح ہویدا گشت از شب   مگر کافور اندر عنبر آمد[50]

مرثیہ سلطان شمس الدین التمش کے سلسلہ میں فرماتے ہیں :-

دلا منا ز چو قارون بمال و نعمت وجاه   مباش انچہ زاں دم کہ جاه کرد و جاه

---

[47] دیوان جمال الدین ہانسوی جلد اول ص ۱۳۵ ، [48] ایضاً ص ۲۳۸ ، [49] ایضاً ص ۲۱۲

[50] ایضاً ص ۲۷۸ ،

اجل چو تیغ قضا برکشد ندارد پاک   ز بادشاہ و وزیر و امیر و فیل و سپاه

———.———

اسیر باز اجل گشت چو مرغ ضعیف   خدایگان سلاطین دہر ظل اللہ

———.———

شہی ستاره حشم چرخ قدر شمس الدین   سر ملوک جہاں طیب اللہ ثراه

چو پائے بر سر تختش نہاد پیک اجل   ز ملک و ملک جہاں گشت دست او کوتاه

بتخت رفت ز بالائے تخت خسرو دہر   بچار چوب فنا پا نہاد از سر گاه[51]

شیخ الاسلام حضرت فرید الحق والدین مسعود قدس سرہم کی مدح میں فرماتے ہیں :-

ختم المشائخ آمد ذاتش ولے مگوئی   کاندر ثنا و ذاتش توقیر میرود

کز صد یکے نگفتم از آفرین او   بس در میان مدحش تقصیر میرود

تیراست در بہا و تو خوے بد جمال   اما چہ پیر محو کند تیر میرود[52]

دیوان جلد دوم کے قطعات ملاحظہ ہوں ،

گر ترا رحمتی رسد زنہار   صبر کن غم مخور ز حیرانی

کہ چنیں آمده است در قرآں   بعد دشواریست آسانی[53]

———.———

ہر کہ اعلم با عمل یار است   او نیز و خدا ز اخیار است

---

[51] دیوان جمال الدین ہانسوی جلد اول ص ۳۹۸ ، [52] ایضاً ص ۱۰۴

[53] ایضاً ,, ,, ,, دوم ,, ۱۵ ،

عمل او درخت فردوس است میوۂ آں درخت دیدار است[51]

بے یاد تو ایں دلم مشوش باشد لیکن چوں ترا یاد کند خوش باشد

ماہیت کند یا دبباکے در آب واں جانورے کہ او در آتش باشد[52]

ضرورت ہے کہ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے ان کمیاب دیوانوں کو تصحیح کرکے پھر شائع کیا جائے، اپنی قدامت اور ندرت کے اعتبار سے یہ اُس کے مستحق ہیں،

---

۵۱ دیوان جمال الدین ہانسوی جلد دوم ص ۵، ۵۲ ایضاً ص ۸،

۵۳ ایضاً ص ۲۵،

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل اور متفرق پرچے،

معارف علوم و معارف کا گنجینہ مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، اس کی اسی دلآویزی اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازہ شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا ہے، مشرقیات کے جن غیر مسلم فضلائے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور اُن کی نگرانی میں دار المصنفین کے نقاد و محققین نے اُن کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل سالوں کے فائل تو بالکل مکمل موجود ہیں:- ۱۹۳۰، ۳۵، ۱۹۳۷، ۱۹۳۸، ۱۹۳۹، ۱۹۴۱، ۱۹۵۱، ۱۹۵۳، ۵۴، ۱۹۵۵، ۵۶ء، ۱۹۶۲، ان کو خرید کر اپنے کتبخانہ کی رونق بڑھائیں:-

"منیجر"

استغنار اور بے نیازی

از

مولوی حافظ محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی ایم اے (علیگ)

اصل بے نیاز تو اللہ کی ذات ہے، اِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ (بلاشبہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے) انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ وہ اس ذاتِ مستغنی کے سوا پوری دنیا سے بے نیاز ہو جائے، اور یہ سمجھ لے کہ جو کچھ ملے گا، اسی سے ملے گا، غیر کے آگے ہاتھ پھیلانا بے کار ہے، خدا کی کارسازی کا یقین دلوں کو طمانیت و قناعت کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے، قانع شخص کسی کے زر و جواہر پر نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالتا، بلکہ ہمیشہ پروردگارِ عالم کی شانِ ربوبیت پر نظر رکھتا ہے، مال و دولت سے حرص کا خاتمہ نہیں ہوتا، بلکہ قناعت ہی باعثِ سکون و اطمینان ہے، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بڑی حقیقت افروز بات کہی ہے،

لیس الغنی عن کثرۃ العروض دولت مندی مال و اسباب کی

لکن الغنی غنی النفس، کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل

تونگری دل کی تونگری ہے،

شیخ سعدی نے "تونگری بدل ست نہ بہ مال" کہکر حدیثِ نبوی کے اسی مفہوم کو پیش کیا ہے، ایک اور حدیث میں حضورؐ نے اس نکتہ کو اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا ہے، حضرت ابو ذرؓ راوی ہیں کہ ایک بار مجھ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ابوذر! تمہارے خیال میں مال کی کثرت کا نام تونگری ہے، ؟ میں نے عرض کیا "جی ہاں" فرمایا "تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے، ؟ میں نے اثبات میں جواب دیا فرمایا "استغنا دل کی بے نیازی ہے، اور محتاجی دل کی محتاجی![1]"

حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں، کہ جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے[2]

تاریخ اسلام میں خدا کے سوا ساری دنیا سے بے نیازی کے بصیرت افروز واقعات بکثرت ملتے ہیں، سیکڑوں علمائے حق ہیں جنھوں نے غیر معمولی علم وفضل اور اثر ونفوذ کے باوجود ساری زندگی فقر وفاقہ میں گذار دی، اور کبھی زر وجواہر کی چمک دمک کی طرف نظر نہیں ڈالی،

حضرت سلمہ رضؓ بن دینار (المتوفی سنہ ۱۴۰ھ) کو ایک مرتبہ خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نے امام زہری کی وساطت سے بلا بھیجا، انھوں نے کہا مجھے تو اون سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر اُن کو ضرورت ہو تو میرے پاس خود آئیں[3]

صفوان بن سلیم زہری (المتوفی سنہ ۱۳۲ھ) کی بے نیازی کا یہ حال تھا کہ فرمانروا اُن کی مدد کرنا چاہتے تھے، مگر وہ قبول نہیں کرتے تھے، ایک بار سلیمان بن عبد الملک مدینہ منورہ آیا، اور حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کے ہمراہ مسجد نبویؐ کی زیارت کو گیا، نماز ظہر کے بعد مقصورہ کا دروازہ کھولا، تو اس میں صفوان نظر آئے، سلیمان پہچانتا نہ تھا، حضرت عمر بن عبد العزیزؓ سے پوچھا یہ کون بزرگ ہیں، عمرؓ بن عبد العزیز نے کہا "امیر المومنین! یہ صفوان

۱؎ فتح الباری ج ۱۱ ص ۲۳۲، ۲؎ مستدرک حاکم ج ۴ ص ۳۵۲، ۳؎ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۴۴۱،

بن سلیم ہیں" اُن کا نام سُن کر اُس نے غلام کو پانچ سو دینار کی تھیلی اُن کی خدمت میں پیش کرنے کا حکم دیا، غلام نے لے جا کر پیش کی، اور کہا کہ یہ امیر المومنین کی جانب سے نذر ہے، وہ یہاں موجود ہیں، صفوان نے کہا تم کو غلط فہمی ہوئی ہے کسی اور کے پاس بھیجی ہوگی، غلام نے عرض کیا، آپ صفوان نہیں ہیں، ؟ فرمایا "ہوں تو میں ہی" غلام نے کہا تو آپ ہی کو حکم دیا ہے، فرمایا "جاؤ دوبارہ پوچھ آؤ" جیسے ہی غلام پوچھنے کے لئے لوٹا صفوان فوراً جوتا اٹھا کر مسجد سے نکل گئے، اور پھر جتنی دیر سلیمان مسجد میں رہا، دکھائی نہ دیئے[1]

مشہور اموی حکمراں ہشام بن عبد الملک حج کے سلسلہ میں مکہ معظمہ گیا ہوا تھا، ایک دن خانہ کعبہ میں حضرت سالم (عمر فاروقؓ کے پوتے) سے ملاقات ہوئی، خلیفہ نے کہا، حضرت مجھ کو خدمت کا موقع دیا جائے، حضرت سالم نے فرمایا "اللہ کے گھر میں اللہ کے سوا کسی سے مانگنا شرم کی بات ہے" جب دونوں حضرات کعبہ سے باہر نکلے تو خلیفہ نے پھر عرض کیا کہ اب تو کعبہ سے باہر ہیں، اب کچھ طلب فرمائیں، حضرت نے فرمایا میں آپ سے کیا مانگوں، دنیا یا دین، ؟ ہشام نے کہا کہ دنیا، ارشاد ہوا:-

"دنیا تو میں نے اس کے مالک حقیقی سے بھی کبھی طلب نہیں کی، پھر آپ سے کیسے مانگوں![2]

حافظ مسعر بن کدام (المتوفی سنہ ۱۵۵ھ) آخرت کی بازپرس سے ہر وقت لرزاں اور ترساں رہتے تھے، اور اس کے نتیجے میں وہ دنیا اور اس کی شان وشوکت سے بالکل بے نیاز تھے، چنانچہ حکومت کے عہدوں کو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے، خلیفہ ابوجعفر منصور ان کا عزیز تھا، اس نے اُن کو کسی مقام کا حاکم بنانا چاہا، انھوں نے فرمایا کہ میرے

۱؎ صفوۃ الصفوہ ص ۱۴۸، ۲؎ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۹۸،

گھر والے تو مجھ کو ۲ دو درہم کا سودا لانے کے لائق بھی نہیں سمجھتے، اور تم مجھے والی بنانا چاہتے ہو"،[1]

حافظ عبد اللہ بن وہب (المتوفی ۱۹۷ھ) امام مالک کے ارشد تلامذہ میں تھے، حفظ حدیث، وسعتِ علم، اور کثرتِ تصانیف میں اُن کو بلند مرتبہ حاصل تھا، انھوں نے تاحیات دربارِ خلافت سے اپنا دامن بچائے رکھا، گو اس سلسلہ میں ان کو بعض مصائب بھی برداشت کرنے پڑے، امام ذہبی نے لکھا ہے کہ عباد بن محمد والی مصر نے ایک بار ان کو بلایا، اور اُن کے سامنے عہدۂ قضا پیش کیا، انھوں نے اس سے کسی طرح پیچھا چھڑایا، اور روپوش ہوگئے، عباد کو اُن کے غائب ہونے کی اطلاع ملی، تو اُس نے غصہ میں اُن کا گھر گروا دیا، مگر اس کے باوجود انھوں نے اس عہدہ کو قبول کرنا پسند نہیں کیا،[2]

لیث بن سعد (المتوفی ۱۷۵ھ) اپنے اخلاق و اوصاف اور سیرت و کردار میں اسلامی زندگی کا مثالی نمونہ تھے، خلیفہ منصور نے اُن کے سامنے مصر کی امارت پیش کی، مگر انھوں نے انکار کر دیا، اور شدتِ اصرار کے باوجود اپنے فیصلہ پر جمے رہے،[3]

علمائے حق کی دربار سے بے تعلقی یا کم از کم اُس کی کسی ذمہ داری کو قبول کرنے سے گریز کا سبب یہ تھا، کہ حکومت سے منسلک ہونے کے بعد کسی معاملہ میں اظہار حق کی گنجائش نہیں تھی، جن بزرگوں نے اعلیٰ مناصب کو قبول کر لیا، وہ بڑی آزمایش میں رہے، اور اس آزمایش میں مبتلا ہونے کے بعد دو چار ہی بزرگ ایسے تھے، جو اپنی حق گوئی اور جرأت سے سلامت بچ گئے، ورنہ زیادہ تر لوگوں کا دامن اس آزمایش میں داغدار ہو کر رہا،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۰، ۷، [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۷۹،

[3] تہذیب التہذیب ذکر لیث،

امام سفیان ثوری (المتوفی ۱۶۱ھ) کی ذات علم و عمل دونوں کی جامع تھی، اُن کے علم و فضل اور سیرت و کردار کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا تھا، وہ امرا اور خلفا سے ہمیشہ خود بے تعلق رہے، اور اپنے تعلق کے لوگوں کو بھی اس سے روکتے رہے، ایک بار منصور نے مسجد حرام میں بھینٹ ہوگئی، اُس نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اور کعبہ کی طرف رُخ کر کے کہا کہ "قسم ہے اس عمارت (کعبہ) کی، مجھے آپ نے کیسا آدمی پایا، یہ وقت بڑا نازک تھا، مگر امام نے بڑی جرأت سے اپنے دل کی بات کہہ دی، اور فرمایا "کعبہ کے رب کی قسم۔ میں نے تم سے بدتر آدمی نہیں پایا"،

قاضی حفص بن غیاث بغداد و کوفہ کے چیف جسٹس تھے، دنیا کی ہر طرح کی آسائشیں اُن کے قدموں میں ڈھیر تھیں، لیکن بایں ہمہ اُن کے فرط استغنار کا یہ عالم تھا کہ سرکاری خزانہ سے اُن کو تین سو درہم ماہانہ مشاہرہ ملتا تھا، لیکن وہ اس میں سے اپنے جملہ مصارف کے لئے صرف سو درہم رکھ کر بقیہ رقم مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے،

(اخبار القضاۃ ۱۸۴/۳)

حماد بن سلمہ دوسری صدی ہجری کے اواخر کے ایک جلیل القدر محدث ہیں، علمی تبحر اور فنی مہارت کے ساتھ فضائل اخلاق سے بھی متصف تھے، امرا و اعیان سلطنت کی صحبت سے گریز اور اہلِ دنیا سے استغنا ان کا وصف امتیازی تھا، اس سلسلہ میں علامہ ابن جوزی نے اُن کی کتاب زندگی کا درج ذیل کا واقعہ بہت تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے،

مقاتل بن سلیمان الخراسانی کا بیان ہے کہ میں حماد بن سلمہ کے پاس گیا، تو ان کے گھر میں ایک چٹائی کے علاوہ کچھ نہ پایا، اسی پر بیٹھے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے،

ایک چمڑے کا توبڑہ تھا جس میں اُن کا سارا علم (یعنی روایات حدیث نبوی) بند تھا، ایک
وضو کا برتن تھا، ان کا بیان ہے کہ ایک دن اُن کی موجودگی میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، انھوں
نے اپنی لونڈی سے کہا کہ دیکھو بیٹی کون ہے؟ وہ واپس آکر بولی کہ محمد بن سلیمان کا قاصد (غالباً
یہ بصرہ کا امیر تھا) فرمایا کہ جاؤ کہدو کہ وہ تنہا میرے پاس آئے، وہ قاصد آیا، اور اُس
نے ایک خط پیش کیا جس کا مضمون یہ تھا،

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ محمد بن سلیمان کی طرف سے حماد بن سلمہ کے نام۔ اما بعد۔
خدا آپ کو اسی طرح سلامت رکھے، جس طرح اُس نے اپنے اولیاء اور اطاعت گذاروں
کو سلامت رکھا ہے، ایک مسئلہ درپیش ہے اگر آپ تشریف لاتے، تو اس کے بارے
میں آپ سے استفادہ کرتا، والسلام"

یہ خط ملا تو آپ نے پڑھ کر لونڈی سے کہا کہ قلم دوات لاؤ، اور اس کی پشت پر
یہ جواب لکھدو:-

"امابعد آپ کو بھی خدا اسی طرح سلامت رکھے جس طرح اپنے دوستوں اور فرمانبرداروں
کو سلامتی عطا کرتا ہے، میں نے بہت سے ایسے علماء کی صحبت اختیار کی ہے جو کسی کے
پاس جایا نہیں کرتے تھے، (اس لئے میں بھی معذور ہوں) اگر آپ کو کوئی مسئلہ سمجھنا ہو
تو آپ خود تشریف لے آئیں، اور جو دریافت کرنا چاہیں دریافت کریں، اور اگر
آنے کا ارادہ ہو تو تنہا تشریف لائیے گا، آپ کے ہمراہ خدم و حشم نہ ہوں
ورنہ میں آپ کے ساتھ اور اپنے ساتھ خیر خواہی نہ کرسکوں گا"

والسلام

قاصد یہ جواب لے کر واپس چلا گیا، راوی کا بیان ہے کہ ہم ابھی بیٹھے ہی ہوئے تھے

کہ کسی نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا، لونڈی کو حکم دیا کہ دیکھو کون ہے، اس نے آکر کہا کہ محمد بن
سلیمان، فرمایا کہدو کہ آجائیں، مگر تنہا آئیں، چنانچہ وہ خدمت میں حاضر ہوا، اور سلام کرکے
بیٹھ گیا، اور تھوڑی دیر بعد بولا کیا وجہ ہے کہ جب بھی میں آپ کے سامنے ہوتا ہوں، میرے
اوپر خوف و دہشت طاری ہوجاتی ہے؟ حماد بن سلمہ نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کا ارشاد ہے کہ جب عالم اپنے علم دین کے ذریعہ خدا کی خوشنودی چاہتا ہے تو اس سے ہر چیز
ڈرنے لگتی ہے، اور جب وہ اس سے دنیا کے خزانے چاہتا ہے تو وہ خود ہر چیز سے ڈرنے
لگتا ہے،

محمد بن سلیمان نے پوری توجہ کے ساتھ یہ باتیں سنیں اور پھر کہا کہ یہ چالیس ہزار درہم
حاضر خدمت ہیں، انھیں اپنی ضروریات میں صرف فرمائیں، حماد بن سلمہ نے کامل استغناء کے
ساتھ فرمایا کہ ان کو لے جاؤ، اور جن لوگوں پر ظلم کرکے ان کو حاصل کیا ہے، اُن کو دے
ڈالو، وہ بولا، کہ بخدا میں یہ اپنے خاندانی ورثہ سے دے رہا ہوں، فرمایا مجھے اس کی ضرورت
نہیں ہے، مجھے معاف کرو، خدا تعالیٰ تمہیں معاف کرے، تم اس رقم کو تقسیم کردو، وہ بولا
کہ میری تقسیم میں اگر کسی مستحق کو نہ ملا، تو وہ ناانصافی کی شکایت کرے گا، لیکن آپ نے
پھر یہی فرمایا کہ مجھے معاف ہی رکھو، (صفوۃ الصفوہ ۳/۲۷۴)

امام عبداللہ بن ادریس (المتوفی ۱۹۲ھ) زندگی بھر جاہ و منصب سے
کنارہ کش رہے، خلیفہ ہارون الرشید نے ایک بار اُن کے سامنے قضا کا عہدہ پیش کیا، اور
اس کے قبول کرنے پر از حد اصرار کیا، لیکن ابن ادریس نے اپنی عدم صلاحیت کا حیلہ کرکے اس
پیش کش کو مسترد کردیا، ان سے پہلے خلیفہ مذکور نے یہ منصب حافظ وکیع کے سپرد کرنا چاہا تھا
مگر انھوں نے بھی ٹھکرا دیا تھا، اور بالآخر قاضی حفص نے اس کو قبول کرلیا، پھر ہارون نے

پانچ ہزار درہم بطور زادراہ پیش خدمت کئے، تو اوّل الذکر دونوں ائمہ نے اس کو بھی لینے سے انکار کر دیا، اور ابن غیاث نے لے لیا، اس واقعہ کے بعد ابن ادریس کو قاضی حفص کی جانب سے سخت تکدر پیدا ہو گیا تھا کیونکہ انھوں نے ائمہ سلف کی شان استغنار کو ٹھیس پہنچائی تھی، بروایت صحیح منقول ہے کہ ابن ادریس نے اس کے بعد قاضی حفص سے تاحیات بات نہ کرنے کی قسم کھالی تھی، اور اس پر قائم رہے،

(تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۵۸)

انہی کے استغنار کا ایک دوسرا واقعہ منقول ہے کہ ایک بار خلیفہ ہارون حج کی غرض سے مکہ معظمہ جا رہا تھا، ہمراہ کوفہ سے اس کا گذر ہوا، اس کے ہمراہ اس کے دونوں لڑکے امین اور مامون کے علاوہ قاضی ابو یوسف بھی تھے، کوفہ پہنچکر اس نے حکم دیا کہ تمام مقامی شیوخ جمع ہوں تاکہ امین اور مامون ان سے حدیث کی سماعت کر سکیں، چنانچہ حسب الحکم تمام علماء خلیفہ کی فرودگاہ پر مجتمع ہو گئے، لیکن عبداللہ ابن ادریس اسے وقار علمی کے منافی تصور کر کے نہیں آئے،

شیوخ کوفہ سے اکتساب فیض کے بعد امین و مامون امام عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اُن سے سو حدیثیں سنیں، اس کے بعد مامون نے اُن کی خدمت میں کچھ مال و زر پیش کیا، لیکن شیخ نے اُس میں سے کچھ بھی قبول کرنا گوارا نہ کیا، پھر مامون نے اس رقم کو دوگنا کر کے پیش کیا، شیخ نے نہایت غصہ ہو کر فرمایا خدا کی قسم اگر تم اس مسجد کو فرش سے چھت تک بھر کر پیش کرو تو بھی میں حدیث رسول کی تعلیم پر ایک حبہ لینا گوارا نہیں کر سکتا، (البدایہ والنہایہ ۱۰/۲۰۸)

حافظ عفان بن مسلم (المتوفی ۲۲۰ھ) نے حق کے معاملہ میں نہ تو کبھی ارباب سطوت و حکومت کے سامنے سر خم کیا، اور نہ مال و متاع کی حرص اُن کے پایۂ استقامت کو متزلزل

کر سکی، بروایت صحیح منقول ہے کہ

"ایک بار ہارون کو دس ہزار دینار اس غرض سے دئے جا رہے تھے کہ فلاں شخص کے بارے میں سکوت اختیار کریں، نہ اُسے عدول کہیں اور نہ غیر عدول، لیکن امام موصوف نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا، اور فرمایا

لا ابطل حقا من الحقوق   میں کسی شخص کا حق ختم نہیں کر سکتا

شذرات الذہب ۲/۴۴)

اسی طرح حضرت فلاں سے مروی ہے کہ

"ایک شخص نے حافظ عفان کو دو ہزار دینار دے کر کہا کہ آپ فلاں آدمی کی عدالت کی تصدیق فرما دیجئے، لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور فرمایا، میں ایک غلط بات کو ہرگز صحیح نہیں کہہ سکتا"

(میزان الاعتدال ص ۲/۲۰۳)

حافظ ابو نعیم (المتوفی ۲۱۹ھ) مال و دولت اور زخارف دنیا سے بہت بے نیاز تھے۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگوں نے اُن پر تعلیم کی اجرت لینے کا الزام عائد کیا ہے مگر ابو نعیم نے فرمایا:-

"اگر لوگوں کا یہ خیال صحیح ہوتا، تو میرے ۱۳ نفری گھر کی عسرت اس عالم کو نہ پہونچتی کہ اس وقت میرے گھر میں ایک روٹی بھی نہیں ہے"

(تہذیب التہذیب ۸/۲۷۵)

فرط احتیاج کے باوجود استغناء و بے نیازی کی یہ روشن مثالیں صرف قرونِ اولیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ ہر زمانہ میں ایسے بندگان باصفا کثرت سے پائے جاتے رہے جن کے قدموں میں دنیا خود سے آکر گرتی تھی، مگر اس کی طرف التفات نہیں کرتے تھے، اور حسرت کی زندگی کو دولت دوجہاں سمجھتے تھے، ہندوستان کی تاریخ بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں ہے،

شیخ میاں ہمایوں کے زمانہ کے ایک برگزیدہ بزرگ تھے، ہمایوں اُن کا بہت معتقد تھا، وہ فرطِ اعتقاد میں ان کو نذر دینے کی کوشش کرتا تھا لیکن وہ قبول نہ کرتے تھے ایک مرتبہ اُسنے اُن کے پاس ایک سادہ کاغذ پر اپنی مہر لگا کر بھیج دی، کہ وہ جتنے گاؤں اور جتنی رقمیں چاہیں، اس پر اپنے لئے لکھ لیں لیکن انھوں نے یہ کہکر انکار کردیا، کہ مجھ کو اس کی ضرورت نہیں، اور بلا ضرورت کسی کا حق مار کر فائدہ اٹھانا جائز نہیں، شاہی قاصدوں نے عرض کیا کہ اگر آپ قبول نہیں فرماتے تو اپنے لڑکوں کو دیدیں اُن کو ضرورت ہوگی، اس کے جواب میں کہا کہ وہ چاہیں لیں یا نہ لیں، میں اُن کو کوئی حکم نہیں دیتا، شاہی قاصدوں نے لڑکوں کی طرف رجوع کیا، تو وہ بولے "بیٹا وہ ہے جو باپ کے نقشِ قدم پر گامزن رہے"[1]

شیخ حمید الدین ناگوری کے پاس ایک بیگہ زمین تھی، اسی میں اپنے ہاتھ سے کھیتی کرتے اور اہل وعیال کے لئے روزی فراہم کرتے، ایک چادر کمر سے باندھتے، اور دوسری جسم پر ڈال لیتے، بیوی کے سر پر ٹھیک سے ڈوپٹہ تک نہ ہوتا، ناگور کے حاکم نے شیخ کی اس درویشی اور تنگدستی کی اطلاع بادشاہ وقت کو دی، بادشاہ نے پانچ سو نقرئی تنکے کے ساتھ ایک گاؤں کا فرمان جاری کیا جب سرکاری عہدہ دار یہ فرمان لے کر شیخ کی خدمت

[1] اخبار الاخیار ص ۲۱۸،

میں پہنچا تو شیخ اندر گئے اور بیوی سے کہا کہ بادشاہ نے پانچسو نقرئی تنکے اور ایک گاؤں کا فرمان بھیجا ہے، تم کیا کہتی ہو، شیردل بیوی نے کہا یہ قبول کر کے آپ اپنی فقیری کو برباد کیجئے، گھر میں ابھی تھوڑے سے جو موجود ہیں، دو سیر سوت میں نے کات لیا ہے، جس میں میرا ڈوپٹہ اور آپ کا تہبند بن جائے گا، شیخ اپنی بیوی کی یہ بات سُن کر بہت خوش ہوئے اور باہر آکر سرکاری عہدہ دار سے کہا کہ تمھاری لائی ہوئی چیزوں کی حاجت نہیں،[1]

ایک بار سلطان ناصر الدین محمود کا ملتان کی طرف جانا ہوا تو راستہ میں اجودھن پڑا، جہاں بابا فرید الدین گنج شکرؒ اپنی خانقاہ میں رہتے تھے، سلطان نے اپنے وزیر الغ خاں (بلبن) کو کچھ نقد رقم اور چار گاؤں کا فرمان شیخ کی خدمت میں پیش کرنے کا حکم دیا، چنانچہ الغ خاں یہ رقم اور گاؤں کا فرمان لے کر بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ مسکرائے اور فرمایا کہ یہ نقد رقم تو رہنے دو درویشوں کی ذات پر خرچ کروں گا، لیکن یہ فرمان واپس لیجاؤ، اس کے اور بہت سے طالب ہیں، انہی کو دیدو،[2]

بہار شریف کے حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحیٰی منیری کی درویشی کا واقعہ بھی سننے کے لائق ہے، سلطان محمد تغلق نے بہار کے حاکم کو فرمان بھیجا، کہ حضرت مخدوم کے لئے خانقاہ تعمیر کرادی جائے، اور اس کے اخراجات کے لئے راجگیر کا پرگنہ ان کے حوالے کیا جائے، اگر وہ قبول نہ کریں تو اُن کو مجبور کیا جائے، چنانچہ حضرت نے مجبوراً جاگیر تو قبول کر لی، مگر ہمیشہ اسے اپنے لئے بار سمجھتے رہے، جب سلطان محمد تغلق کی وفات کے بعد فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا تو آپ دہلی تشریف لے گئے، درباریوں کو خیال ہوا کہ شاید حضرت مخدوم الملک جاگیر میں اضافہ چاہتے ہیں، لیکن اس وقت لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب

[1] سیر الاولیاء ص ۱۵۷، [2] فوائد الفواد ص ۹۹،

شیخ نے جاگیر کی سند نکال کر سلطان کے ہاتھ میں دے دی، اور فرمایا خدا کے لئے اُس کو واپس لے لیجئے، یہ میرے کام کی نہیں، چلتے وقت سلطان نے اخراجاتِ سفر کے لئے ایک بڑی رقم پیش کی، دل جوئی کے خیال سے اس کو قبول تو کر لیا، لیکن دربار سے نکلتے ہی اسے فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا، اور فقیرانہ شان سے وطن واپس ہو گئے،[1]

ایک بزرگ شیخ عبدالقادر ثانی (المتوفی ۹۴۰ھ ۱۵۳۳ء) گذرے ہیں، جب وہ اپنے والد محمد حسینی کے بعد مسندِ ارشاد پر بیٹھے، تو بادشاہِ وقت نے اُن کے والد کے تمام کاغذات مناصب اور وظائف کی بحالی کے ساتھ ایک نیا فرمان بھی اُن کے نام جاری کیا، لیکن انھوں نے ان تمام چیزوں کو واپس کر دیا، اور کہلا بھیجا کہ اب ہمیں اس میں کسی چیز کی حاجت نہیں ہے، آپ جس کو چاہیں دیدیں،

ایک بار بادشاہ نے اُن کو اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی، اس کے جواب میں انھوں نے یہ لکھ بھیجا ہے۔

چو ہیچ باب ازیں باب در نشستن نیست　　ہر آنچہ بر سرما می رود مبارک باد

کسے کہ خلعتِ سلطانِ عشق پوشیدہ است　　بحلّہائے بہشتی کجا شود دل شاد

ایک مرتبہ گجرات کے وزیر نے شیخ علی ملتانی (المتوفی ۹۷۵ھ ۱۵۶۷ء) کو اپنے گھر پر مدعو کیا، تو انھوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اپنے در دولت پر آنے سے معذور رکھیں، فقیر یہیں سے دعا کرتا ہے، لیکن جب اس وزیر نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا، یہ فقیر تین شرطوں کے ساتھ آنے کے لئے تیار ہے، (۱) جہاں چاہوں گا بیٹھوں گا، مجھ کو صدر میں بٹھانے کی کوشش نہ کریں، (۲) اس کے لئے بھی اصرار نہ ہو کہ میں یہ کھاؤں گا اور وہ کھاؤں گا، میرا جو جی چاہے گا

[1] سیرت اشرف ص ۳۶۰،

کھاؤں گا، (۳) جب چاہوں گا، آپ کی مجلس سے اٹھ کھڑا ہوں گا، اس کے بعد اصرار نہ ہو گا، وزیر نے یہ تینوں شرطیں منظور کر لیں، جب وہ اس کے محل کی طرف چلے تو روٹی کے چند ٹکڑے اپنی اس تھیلی میں ڈالے جو اُن کی گردن میں لٹکی رہتی تھی، تنہا وزیر کے محل میں پہنچے، اور دروازہ کے قریب بیٹھ گئے، وزیر نے شاہانہ طریقہ پر جو فرش و فروش بچھائے تھے، اُس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، جب طرح طرح کے کھانے چُنے گئے، تو انھوں نے اپنی تھیلی میں سے روٹی کے چند ٹکڑے نکالے اور کھانے لگے، اور وزیر کے دسترخوان کی کوئی چیز نہ چکھی، اس کے بعد وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، خدا حافظ کہا اور السلام علیکم کہکر محل سے باہر نکل گئے، فرمایا شرط یہی تھی کہ جب چاہیں گے، واپس لوٹ آئیں گے،

(بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں بحوالہ اخبار الاخیار ص ۲۴۸)

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

دہلی کالج اور مدرسہ دار البقاء

از

جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب واصف

جن دنوں مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم سوانح مولانا محمد قاسم مفتی کفایت اللہ تصنیف فرما رہے تھے، موصوف نے چند سوالات حضرت العلامہ مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجے جن میں سے ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ مدرسۂ دار البقا جس میں حضرت نانوتویؒ کا قیام تھا، کون سا مدرسہ تھا، اور کہاں تھا، کیا یہ وہی مدرسہ ہے، جس کے صدر مدرس مولانا مملوک العلی نانوتوی تھے؟ کیا اسی میں مولانا محمد قاسمؒ کا داخلہ ہوا تھا؟ امور مستفسرہ کے جواب کی خدمت والد ماجد نے احقر کے سپرد فرمائی۔ زیرِ نظر مقالہ جو مولانا موصوف کے مکتوب گرامی کے جواب میں لکھکر بھیجا گیا تھا، لبعد نظر ثانی پہلی مرتبہ شائع کیا جا رہا ہے، اس مقالہ کی تیاری میں مندرجۂ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یادگار دہلی مصنفہ مولوی سید احمد دہلی اللّٰہی مصنف فرہنگ آصفیہ۔ تاریخ آثار دہلی مصنفہ سید عبد العزیز دہلوی۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔ مرحوم دہلی کالج از مولوی عبد الحق۔ واقعات دار الحکومت دہلی از مولوی بشیر الدین احمد۔ آثار الصنادید از سر سید احمد خاں دہلوی

طبقات الشعراء از مولوی کریم الدین پانی پتی مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۶ء تذکرۂ علمائے ہند از مولینا رحمان علی ممبر کونسل ریاست ریواں مطبوعہ نولکشور۔ حالات طیب مولینا محمد قاسمؒ از مولوی محمد یعقوب نانوتوی مطبوعہ ۱۲۹۷ھ در مطبع صادق الانوار بہاولپور۔ تذکرۂ رحمانیہ مولوی عبد الحلیم پانی پتی۔ غدر کے چند علما از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ مزارات اولیائے دہلی از مولوی محمد عالم شاہ فریدی۔ امیر الروایات ارواح ثلثہ۔ تذکرۃ الرشید از مولینا عاشق الٰہی میرٹھی۔

حیات النذیر سید افتخار عالم مارہروی۔ ابجد العلوم از نواب صدیق حسن خان۔

مولانا محمد قاسمؒ ۱۲۴۸ھ میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیوبند میں مولوی مہتاب علی کے مکتب میں اور پھر سہارنپور میں مولوی محمد نواز سے حاصل کی۔ اس زمانے میں دہلی شہر بڑے بڑے علماء و فضلا کا مرکز تھا۔ خاندان ولی اللّٰہی کے تلامذہ اور متنسبین درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت میں مصروف تھے، انھیں میں سے ایک عظیم الشان ہستی مولینا مملوک العلی نانوتوی کی تھی، جو مدرسہ دہلی کے صدر مدرس تھے، ۱۲۵۸ھ ہجری میں مولینا موصوف نے رخصت لیکر حج کا ارادہ کیا، حج سے فارغ ہو کر برس دن کے بعد اپنے وطن نانوتہ تشریف لائے۔ اس وقت مولانا محمد قاسم بھی وہیں تھے، دس گیارہ سال کی عمر تھی، مولینا مملوک العلی نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو اپنے ساتھ دہلی لے جاؤں گا۔ انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔ اور والدہ سے اجازت لے کر ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ ہجری کے آخر میں وطن سے روانہ ہو کر دوسری محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہونچے۔ چوتھی محرم کو سبق شروع ہوئے۔ مولوی محمد قاسم نے کافیہ شروع کی۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی ابن مولانا مملوک العلی لکھتے ہیں۔ کہ "والد مرحوم نے میری
ابواب کا سننا اور تعلیلات کا پوچھنا ان کے سپرد کیا تھا۔ اور ہر جمعے کی رات کو کبھی
ہوتی تھی صیغوں اور ترکیبوں کا پوچھنا معمول تھا، یاد ہے کہ مولوی صاحب سب میں
عمدہ رہتے تھے، اسی زمانے میں ہمارے مکان کے قریب مولوی نوازش علی کی مسجد میں
مجمع طالب علموں کا تھا۔ ان سے پوچھ پاچھ اور بحث شروع ہوئی۔ مولوی صاحب کی
جب باری آئی سب پر غالب آئے۔ اور جب گفتگو ہوتی اس میں مولوی صاحب کو
غلبہ ہوتا۔"

مولنا محمد قاسم نے دہلی کالج میں داخل ہو کر بھی کچھ دنوں تعلیم پائی ہے جس کے
شعبۂ مشرقی کے صدر مدرس مولنا مملوک العلی تھے۔ چند روز میں اقلیدس کے تمام مقالے
دیکھ ڈالے پھر منشی ذکاء اللہ (مصنف تاریخ ہندوستان) چند سوال کسی ماسٹر کے بھیجے
ہوئے لائے جو نہایت مشکل تھے، ان کے حل کر لینے پر مولوی صاحب کی نہایت شہرت
ہوئی۔ مگر امتحان سالانہ میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔ سب اہل مدرسہ
بالخصوص پرنسپل کو بہت افسوس ہوا۔ پھر مطبع احمدی (دہلی) میں اجرت پر تصحیح کتب
کا کام شروع کیا۔ اس وقت تمام درسی کتب آپ پوری کر چکے تھے، اس کے بعد
مولنا رشید احمد گنگوہیؒ کی معیت میں جو شروع ہی سے آپ کے ساتھی اور ہم سبق
تھے، حضرت شاہ عبدالغنیؒ کی خدمت میں حدیث پڑھی، اور اسی زمانے میں دونوں
نے حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو مولنا مملوک
العلی نے وفات پائی تیمارداری میں مولنا محمد قاسم ہر وقت حاضر رہتے تھے آپ کے
انتقال کے بعد مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے مملوکہ مکان واقع کوچہ چیلان میں منتقل ہو گئے

مولانا محمد قاسم بھی اسی مکان میں منتقل ہو گئے۔ تقریباً ایک سال کے بعد مولوی
محمد یعقوب صاحب بسلسلۂ ملازمت اجمیر چلے گئے۔ اور مولانا تنہا اس مکان میں رہے کچھ دنوں
کے بعد مطبع احمدی میں چلے گئے، پھر چند روز دار البقا میں رہے۔ اسی زمانے میں مولنا احمد علی
سہارنپوری نے بخاری شریف کے آخری پانچ چھ پاروں کی تصحیح و تحشیہ کا کام آپ کے
سپرد کیا۔

رحمان علی صاحب تذکرۂ علمائے ہند لکھتے ہیں کہ "بعد از فراغ علوم چندے بکار
دہلی تعلق گرفتہ و بعد ترک آں تعلق در مطبع احمدی بہ تصحیح کتب مقرر شد۔" مطبع احمدی
کوچہ بلاقی بیگم میں (قریب جامع مسجد) واقع تھا۔ منشی اُمّو جان اس کے مالک تھے۔
ہنگامہ ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۳ھ کے بعد بوجہ شبہ الزام بغاوت روپوش رہے اور ۱۲۷۷ھ میں
حج بیت اللہ کو روانہ ہوئے۔ واپسی پر عام معافی کا اعلان ہو چکا تھا۔ دہلی کا مطبع
احمدی ختم ہو چکا تھا۔ منشی ممتاز علی نے میرٹھ میں مطبع ہاشمی میں آپ کو بلا لیا۔ منشی ممتاز علی
مطبع ہاشمی کے قمر کار میں تھے۔

بیعت

مولینا محمد یعقوب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اور مولینا رشید احمد
گنگوہی نے فراغت تعلیم کے بعد ہی حاجی صاحب سے بیعت کی تھی۔ لیکن تذکرہ علماء
ہند سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حاجی صاحب سے ۱۲۷۷ھ میں مکہ معظمہ میں بیعت ہوئے۔
لیکن راقم الحروف کے خیال میں مولانا محمد یعقوب کا بیان صحیح ہے۔ تذکرۃ الرشید سے بھی
اس کی تائید ہوتی ہے، حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲۷۶ھ میں ہجرت فرمائی تھی۔
مولوی محمد قاسم نے ۱۲۸۵ھ میں دوسرا حج کیا۔ حج سے فارغ ہو کر واپس آئے۔

تو منشی ممتاز علی بغرض حج مکہ معظمہ میں ہی تھے۔ مولانا نے اس عرصے میں مولوی محمد ہاشم کے مطبع ہاشمی میں کام کیا۔ پھر منشی ممتاز علی مکہ معظمہ میں ایک سال قیام کرکے واپس آئے[1] اور

[1] منشی ممتاز علی کی ہجرت وغیرہ کے بارے میں مورخین کے بیانات میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے، مولانا امداد صابری نے اپنی تازہ تصنیف "دہلی کی یادگار ہستیاں" میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:-

۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں مولوی محمد ہاشم نے اندر کوٹ میرٹھ میں مطبع ہاشمی جاری کیا۔ بعد میں اس میں منشی ممتاز علی نے شراکت کی۔ مولانا محمد قاسم اس مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے، پھر ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں منشی صاحب مطبع ہاشمی میں سے دو عدد دستی پریس دہلی لے آئے۔ اور محلہ چوڑی والان میں اپنا مطبع مجتبائی قائم کیا۔ اس سے بھی مولانا کا تعلق رہا۔ پھر ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں منشی صاحب نے مطبع مجتبائی کو مولوی عبدالاحد کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اور اپنی چار صاحبزادیوں کے ساتھ ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے۔ "اختر شہنشاہی" میں مطبع مجتبائی کا مقام اجراء دہلی لکھا ہے، میرٹھ نہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ مطبع میرٹھ میں ختم کرکے ہجرت فرما گئے۔ بلکہ انھوں نے دہلی کا مطبع مجتبائی فروخت کرکے ہجرت فرمائی۔ یہ بھی درست نہیں ہے کہ منشی صاحب دوسرے سال ہندوستان واپس آگئے۔ وہ ہجرت کرنے کے بعد ہندوستان نہیں آئے۔ مکہ معظمہ ہی میں وفات پائی اور قبرستان جنت المعلیٰ میں آرام فرما ہیں۔ (دہلی کی یادگار ہستیاں ص ۴۰۱)

واضح ہو کہ منشی صاحب موصوف کے ہجرت فرمانے کے بعد ان کے صاحبزادوں میں منشی مشتاق علی اور منشی عبدالغنی نے کھڑکی تفضل حسین میں مطبع مصطفائی کے نام سے اپنا مطبع قائم کیا تھا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اور اپنا مطبع مجتبائی دہلی میں قائم کیا۔ اور مولانا کو بھی میرٹھ سے دہلی لے آئے۔ ۱۲۸۶ھ میں یہ مطبع مجتبائی منشی صاحب نے مولوی عبدالاحد کے ہاتھ فروخت کر دیا اور ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے۔ اور وہیں وفات پائی۔ مطبع مجتبائی بازار چوڑی والان میں واقع ہے۔ جو اس وقت مولوی عبدالاحد کے لڑکوں کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ اور مطبع مصطفائی جو بعد میں منشی ممتاز علی کے صاحبزادوں نے قائم کیا۔ کھڑکی تفضل حسین خان میں متصل زنانہ وکٹوریہ ہسپتال واقع ہے جو اس وقت منشی ممتاز علی کے پوتوں کے تصرف میں ہے۔ مگر مطبع ختم ہو چکا ہے، صرف نام اور سائن بورڈ باقی رہ گیا ہے۔ منشی ممتاز علی کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے منشی مشتاق علی اور چھوٹے منشی عبدالغنی[2]۔ یہ دونوں خط نسخ میں دہلی کے مایہ ناز استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان کے سیکڑوں شاگرد ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مولانا مملوک علی نانوتوی۔ . . . مولانا رشید الدین خان دہلوی کے شاگرد ہیں۔ اور وہ شاگرد ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ کے۔ اور مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے اور انھوں نے حضرت شاہ محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ مہاجر (نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ) سے اور انھوں نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے پڑھی۔

مولانا رشید الدین خان دہلوی۔ مفتی صدر الدین خان آزردہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نانا رکن المدرسین مولوی منور الدین اور مرزا غالب، حکیم مومن خان دہلوی

[2] راقم الحروف کو خط نسخ میں منشی عبدالغنی سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے استاد خطاطی مولانا اشتیاق احمد صاحب بھی منشی محبوب علی میرٹھی کے واسطہ سے منشی ممتاز علی کے سلسلہ میں داخل ہیں۔

نواب مولوی قطب الدین دہلوی، حکیم آغا خان عیش مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا محمد اسمٰعیل شہید وغیرہ یہ تمام اہلِ کمال ایک ہی زمانے کے ہیں۔

"مدرسہ دہلی"

۱۸۲۵ء میں حکومت انگلشیہ نے مدرسہ غازی الدین (بیرون اجمیری دروازہ) میں علوم مشرقی کا ایک دارالعلوم جاری کیا تھا جس کے صدر مدرس مولانا رشید الدین خان دہلوی مقرر کئے گئے تھے، سر سید احمد خان، منشی ذکاء اللہ، مولوی ضیاء الدین، اور ڈپٹی نذیر احمد اسی کالج کے فیض یافتہ ہیں۔ یہ کالج ۱۸۴۲ء تک مدرسہ غازی الدین کی عمارت میں رہا۔ پھر ریزیڈنسی کی عمارت (متصل کشمیری دروازہ) میں منتقل ہو گیا۔ ریزیڈنسی کی یہ عمارت دراصل ۱۶۳۷ء میں داراشکوہ کا دارالمطالعہ تھا۔ ۱۶۳۹ء میں اس میں پنجاب کے مغل صوبہ دار علی مردان خان کا قیام رہا اور ۱۸۰۳ء میں اس میں ریزیڈنسی سر ڈیوڈ اختر لونی بارٹ ہی، ۱۸۴۲ء سے ۱۸۷۷ء تک اسی میں گورنمنٹ کالج یا (دلی کالج رہا۔ پھر ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۶ء تک مدرسہ ضلع اور ۱۸۸۶ء سے ۱۹۰۴ء تک میونسپل بورڈ اسکول اس عمارت میں رہا۔ پھر گورنمنٹ ہائی اسکول اور دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء) کے دوران گورنمنٹ ہائی اسکول کو ختم کر کے اسی عمارت میں پولی ٹیکنک اسکول قائم کیا گیا جو اب بھی موجود ہے۔

یہ دلی کالج جب ۱۸۴۲ء میں مدرسہ غازی الدین کی عمارت سے داراشکوہ کی عمارت میں منتقل ہوا تو مدرسہ غازی الدین والی عمارت پرنسپل ہی کے سپرد رہی جو بطور بورڈنگ ہاؤس اسی مدرسے کے طلبہ کے کام آتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اس میں پرنسپل نے بطور شاخ کے ایک مدرسہ علوم مشرقی کھولا اس کے بعد پرنسپل سے مدرسہ

غازی الدین کی عمارت گورنمنٹ نے لے لی اور "دارالشفائے یونانی" کے نام سے ایک ہسپتال اس عمارت میں قائم کیا۔ پھر ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد اس عمارت پر پولیس کا قبضہ اور سکونت رہی۔ فروری ۱۸۹۰ء میں اینگلو عربک ہائی اسکول قائم ہوا جو بعد میں عربک کالج بنا۔ اور انقلاب ستمبر ۱۹۴۷ء کے بعد اس کی منتظمہ کمیٹی نے اس کا نام۔ "دہلی کالج" تجویز کیا۔

"مولانا مملوک العلی"

مرحوم دہلی کالج کے صدر مدرس مولوی رشید الدین خان دہلوی کے انتقال کے بعد ان کے عزیز شاگرد مولانا مملوک العلی نانوتوی اس کے مدرس اول ہوئے آپ کے تبحر علمی کے بارہ میں تمام تذکرہ نویس رطب اللسان ہیں۔ اور کئی کئی صفحے لکھے ہیں۔

مولوی کریم الدین مصنف "فرائد الدھر" (طبقات الشعراء) لکھتے ہیں "سوائے درس دہی طلبائے مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ تمام اوقاتِ گرامی ان کے تعلیم طلبہ میں نصف شب تک منقسم ہیں۔ حلیہ ان کا یہ ہے کہ ہنستی پیشانی خندہ رو سفید ریش نورانی صورت متواضع حلیم بُردبار متفکر مدبر دانش مند ہیں۔ باوجود کثرت علم و فضل کے کبھی وعظ عام نہیں کہا۔ اور طالبین علم کے ہجوم اور کثرت درس و تدریس کی وجہ سے تصانیف کتب کی طرف توجہ نہ ہوئی"۔

مولوی عبدالحق اپنی کتاب "مرحوم دہلی کالج" لکھتے ہیں کہ ۱۸۴۷ء میں مولوی مملوک العلی کی عمر تقریباً ساٹھ برس تھی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ان سے پڑھا ہے"۔ مگر عام طور پر تذکروں میں جہاں مرحوم دہلی کالج کے دیگر فیض یافتوں کا ذکر آتا ہے۔ وہاں مولوی محمد قاسم کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے پرائیویٹ

طور پر مولنا مملوک العلی سے گھر پر تعلیم پائی۔ پرائیوٹ درس و تدریس کا دستور اس زمانے میں بالعموم رائج تھا۔ چنانچہ مصنف فرائد الدھر کے بیان سے مولنا کا یہ معمول معلوم ہوتا ہے۔

مولنا محمد یعقوب نانوتوی کا بیان ہے: "کہ مولنا مملوک العلی نے آپ کو مدرسے میں داخل کیا تھا۔ اور ٹیچر دل سے کہا تھا کہ تم ان کے حال سے متعرض نہ ہونا۔ ریاضی اقلیدس وغیرہ میں خود پڑھا لوں گا۔ مگر امتحان سالانہ میں شریک نہیں ہوئے بلکہ ترک تعلق کرکے مطبع احمدی میں ملازمت کرلی۔ اور پھر شاہ عبدالغنی سے حدیث پڑھی۔

مولوی رحمان علی مصنف تذکرۂ علمائے ہند لکھتے ہیں: "بعد فراغ از تحصیل علوم چندے بمدرسہ انگریزی واقع دہلی تعلق گرفتہ و بعد ترک آں تعلق در مطبع احمدی بتصحیح کتب مقرر شد۔"

مرحوم دہلی کالج یا مدرسہ دہلی یا مدرسہ شاہجہان آباد یہ تینوں نام اسی دارالعلوم کے ہیں۔ جو مدرسہ غازی الدین بیرون اجمیری دروازہ میں ۱۸۲۵ء میں قائم ہوا تھا۔ جس کے شعبہ علوم مشرقی کے صدر مدرس مولوی رشید الدین خان دہلوی مقرر ہوئے تھے۔ اور ان کے بعد مولنا مملوک العلی اس کے صدر مدرس رہے اور مولف حیاۃ النذیر کے بیان کے مطابق مولوی سید محمد جو مدرس دوم تھے مولوی مملوک العلی کے انتقال کے بعد صدر مدرس قرار پائے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۴ء تک اسی دہلی کالج میں پڑھا اور مولوی سید محمد سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا۔

یادگار دہلی اور آثار دہلی وغیرہ میں لکھا ہے کہ "ہندیوں کے قبرستان میں مسجد

افغانان کے اندر حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار قادری رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ اور آپ کے پائیں مولنا مملوک علی نانوتوی کا مزار ہے جو استاد الکل تھے۔ اور شمس العلماء مولوی ضیاء الدین اور شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔

"دارالبقا اور دارالشفا"

اس دہلی کالج یا مدرسۂ دہلی کو مدرسۂ دارالبقا کہنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ مدرسہ دارالبقاء اور شفاخانہ دارالشفاء یہ دونوں عمارتیں جامع مسجد شاہجہانی سے تعلق رکھتی تھیں۔ مولانا ابوالحسنات ندوی مصنف "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" کے بیان کے مطابق دارالبقا کا سنگ بنیاد ۱۰۶۰ھ ہجری میں رکھا گیا تھا۔ یہی جامع مسجد کا سال تعمیر ہے۔

داغ کے شاگرد رشید بیخود دہلوی نے راقم الحروف واصف سے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ دارالبقا جامع مسجد کے جنوب مغربی گوشے پر تھا۔ اس گوشے پر اب چند نامعلوم حضرات کے مزارات اور ایک کنواں بہت بڑا اور پختہ شاہی زمانے کا ہے۔ دارالشفا شمال مغربی گوشے پر تھا۔ یہ دونوں مرور زمانہ کی وجہ سے برباد ہوچکے تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی (المتوفی ۱۲۸۵ھ) نے زر خطیر خرچ کرکے ان دونوں کی مرمت کرائی جو حجرے شاہی زمانے کے باقی تھے۔ ان کی حسب ضرورت درستی کرائی۔ اور بعض مجوے شاہی طرز پر از سر نو بنوائے۔ درسگاہیں وغیرہ درست کرائیں۔ اور ان دونوں اداروں کو جاری کردیا۔ اسی وجہ سے یہ دونوں ادارے حضرت مفتی صدر الدین صاحب کی طرف منسوب ہیں لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں یہ دونوں ختم ہوگئے، اور عمارتیں گرا کر صاف میدان کر دیا گیا، جامع مسجد کے آس پاس گول سڑک نکالی گئی، چاروں گوشے کٹ کر الگ ہوگئے اور سرکاری ملکیت ہوگئے۔ عوام انکو گمٹھے کہنے لگے، بعض لوگ سموسے بھی کہتے ہیں۔ یہ سموسے جتنے اب ہیں اس سے بڑے تھے۔ تقریباً ۱۹۳۵ء۔

میں سموت سے کم کرکے سڑکیں چوڑی کی گئیں "یادگار دہلی" کے مصنف نے تیسرے جنوب مشرقی گوشے پر دار الہدیٰ کی نشاندہی کی ہے، چوتھے گوشے کے بارے میں کسی مورخ نے کچھ نہیں لکھا۔

مفتی صدر الدین خان آزردہ کی حویلی بازار چتلی محل میں تھی جو حویلی صدر الصدور کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ اسی حویلی کے اندر حضرت مفتی صاحب کا انتقال ۱۲۸۵ھ میں بعمر ۸۱ سال ہوا۔ ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ کے ہنگامے میں آپ کی ساری جائداد بہ الزامِ بغاوت ضبطی میں آگئی تھی۔ بعد میں بہت تھوڑی سی جائداد واگذار ہوئی۔ مؤلف تذکرۂ رحمانیہ نے لکھا ہے کہ مفتی صدر الدین خان آزردہ کی مولانا مملوک علی سے معاصرانہ چشمک تھی۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ مفتی صدر الدین خاں آزردہ مولانا رشید الدین خان کے معاصر اور ہم سبق تھے۔ بڑے فراخ دل، فراخ حوصلہ اور خلیق تھے اس زمانے میں مدرسۂ دہلی کے انتظامی بورڈ کے ممبر اور مدرسہ کے ممتحن بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب جامع مسجد واگزار ہوئی۔ اور اس کا انتظامی بورڈ بنایا گیا تو مفتی صاحب بھی اس کے ممبر بنائے گئے۔ مولانا مملوک علی نے اپنے دونوں عزیز شاگردوں (مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد) کو ان کا شاگرد بھی کرایا تھا۔ چنانچہ تذکرۃ الرشید میں مفصل طور پر مفتی صاحب سے ان دونوں کے تلمذ کے واقعات مذکور ہیں۔

آثار الصنادید اور واقعات دار الحکومت وغیرہ دیکھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دار البقاء اور دار الشفا جامع مسجد کے ساتھ ہی قائم کئے گئے تھے۔ اور کچھ عرصے کے بعد سلطنت مغلیہ کی آئے دن کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے خستہ و خراب ہو گئے تھے۔ پھر مفتی صاحب نے مرمت کرا کر دونوں اداروں کو از سرِ نو جاری کیا۔ دار الشفا کے

متعلق ۱۲۶۳ھ میں سر سید احمد خان نے لکھا ہے کہ: "شمالی دروازے کی طرف شاہجہانی دار الشفا ہے کہ سابق میں حکیم بیٹھتے تھے، اور دوائی خانہ رہتا تھا۔ اب لوگ رہتے ہیں اور گھر بھی بن گئے ہیں"۔

مولانا محمد قاسمؒ کے متعلق جو مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے کہ کچھ دنوں دار البقا میں رہے وہ بھی دار البقا تھا۔ جو جامع مسجد کے جنوب میں واقع تھا، اور غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے موجود تھا۔ مولانا مملوک علیؒ کی وفات ۱۲۶۷ھ میں ہوئی۔ اس وقت مولانا محمد قاسمؒ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے، اور مطبع احمدی میں ملازم تھے، کچھ دنوں آپ مولانا محمد یعقوب کے مکان واقعہ کوچہ چیلان میں بھی رہے پھر جب وہ بسلسلۂ ملازمت اجمیر چلے گئے تو کچھ دنوں ان کے مکان میں تنہا رہنے کے بعد آپ مطبع احمدی میں اور پھر دار البقا میں منتقل ہو گئے۔ یہ تعلیم و تعلم کا زمانہ نہیں تھا، بلکہ یہ قیام عارضی محض مسافرت کی بنا پر تھا۔

مولانا مملوک العلی کا دار البقا سے کوئی تعلق ثابت نہیں۔ نیز دار البقا کی تعلیمی حالت کے متعلق کچھ سراغ نہیں ملا کہ کون کون حضرات اس کے مدرس تھے۔ اور کیسی تعلیم تھی۔

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں۔

(مولفہ مولانا ابو الحسنات ندوی مرحوم)

ہندوستان کی قدیم تاریخ کی کتابوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیم گاہوں کے حالات بہت کم ملتے ہیں، مولانا ابو الحسنات مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق سے اس کتاب میں قدیم مدرسوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائے ہیں۔ جو قابل مطالعہ ہیں۔   قیمت: ۲ روپئے، ۷ پیسے

بابُ التقریظ والانتقاد

"دہانِ زخم"

جناب اختر انصاری کے قلم نے شاعری کی مختلف اصناف کے علاوہ ادب انشاء اور تنقید کے میدانوں میں بھی جولانیاں دکھائی ہیں نظم و نثر میں اُن کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں اُن کی زیادہ شہرت قطعات کی وجہ سے ہے، دہانِ زخم قطعات کے علاوہ غزلوں نظموں رُباعیات اور ایک مثنوی پر مشتمل ۲۶ء سے ۶۴ء تک کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ منتخب کلام کا مجموعہ ہے،

ابتدائی دور کے رنگِ سخن کا اندازہ اس قطعہ اور غزلوں کے بعض متفرق اشعار سے ہوتا ہے،

صدا ہوں شکستِ تمنّا کی میں
نشانِ محبت کی آواز ہوں
مری شاعری ہے سرودِ حیات
میں فطرت کے ہاتھوں میں اک ساز ہوں

حسین یادوں کی شمعیں مجھے جلانے دو
مزار ہیں مرے سینے میں آرزوؤں کے

لیکن آگے چل کر یہ رنگ پھیکا ہوگیا، اب وہ غمِ دل و غمِ حیات کی پرانی حکایتیں دہرانے کے بجائے نئے حالات اور تقاضوں کی جانب توجہ کرتے ہیں،

حقائق کی زد سے بچا دل نہ اختر
بہت ہم نے خوابوں میں ڈھونڈھیں پناہیں

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

غمِ حیات و غمِ دل کی یہ کہن روداد
مذاقِ نادرہ کاری پہ حرف آتا ہے

مگر اُن کے ہر دور کا کلام درد و کسک سے معمور ہے پہلے اُن کو ماضی کی عشرتوں جوانی کی حسرتوں اور محبت کی ناکامیوں کا دکھ تھا، اور اب وہ حالات کی بے اعتنائی، سماج کی ناہمواری اور اخلاق و

شرافت کے فقدان سے آزردہ نظر آتے ہیں، اُن کے سچے جذبات اور قلبی واردات نے اُن کے کلام کو ایک زخم خوردہ دل کی آپ بیتی اور سوز و گداز کا مرقع بنا دیا ہے، اس حقیقت کا اظہار خود اس طرح کیا ہے

میرا طرزِ سخن نرالا ہے،
میں نے نالوں کو نے میں ڈھالا ہے
میرا مجموعۂ کلام اختر
خون کے آنسوؤں کی مالا ہے

ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں،

غم زدہ ہیں، مبتلائے درد ہیں ناشاد ہیں
ہم کسی افسانۂ غمناک کے افراد ہیں

گردشِ افلاک کے ہاتھوں بہت برباد ہیں
ہم لبِ ایام پر اک دکھ بھری فریاد ہیں

وہ دوسروں کے درد کو اپنا درد تصور کرتے ہیں، اور اُن کی آہ و فغاں سنکر خود مجسّم فریاد بن جاتے ہیں

مبتلائے درد ہونے کی یہ لذت دیکھئے
قصۂ غم ہو کسی کا دل مرا دھک دھک کرے

آبروئے غم اور متاعِ درد کی حفاظت کے لئے اُن کی تدبیریں ملاحظہ ہوں:

ہنستے ہیں دہانِ زخم سے ہم گاتے ہیں فغاں کے بربط پر
آشفتہ سروں کی دنیا کے انداز نرالے ہوتے ہیں

لبوں پہ موجِ تبسم کو رقص کرنے دو
کہ یوں بھی آبروئے غم بچائی جاتی ہے

وہ افکارِ تازہ اور جہانِ نو کی برکتوں سے فیضیاب ہونا اور ظن و تخمین کی تیرہ و تنگ فضاؤں سے نکل کر اس مقام پر پہنچنا چاہتے ہیں جو علم و عرفان کی روشنی سے جگمگا رہا ہو، وہ رسم و رواج کے پرستاروں کو لات و منات کے پجاریوں سے کم ذلیل و بے وقعت نہیں سمجھتے، ملاحظہ ہو:-

رہینِ رسم و روایت ہو جس کی بت شکنی
وہ بت شکن بھی حقیقت میں سومناتی ہے

آج بھی ہے عقیدتوں میں نہاں
روحِ اصنام پوچھئے کیا ہو

فکر کی تیرگی قیامت ہے
روشنی لاؤ دیکھئے کیا ہو

وہ نئے دور کا اسی لئے خیر مقدم کرتے ہیں کہ موجودہ انسان نے اپنی محنت و صلاحیت سے حیرت انگیز

کارنامے انجام دے رہے ہیں، مہر و ماہ اس کی عقل و فکر کی گردِ راہ بن گئے ہیں، اس کے علم و ادراک
نے اوہام کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے، ایک نظم "نیا دور" میں فرماتے ہیں:۔

اک معدنِ زر ہے نئے انسان کی محنت — اے زرگرِ تقدیر! دوکاں اپنی بڑھاؤ
ادراک حقائق سے مسلّح ہے نیا ذہن — اے لشکرِ اوہام! علم اپنے گرا دو
اک مشعلِ شب تاب ہے، ہر ذرۂ خاکی — اے تاروں بھری رات دیئے اپنے بجھا دو
کیا گئے اب اس عالمِ پستی کے فضائل — اے بامِ افلاک! فضیلت کو بھلا دو
اب خلدِ بریں ہے تو یہی اپنی زمیں ہے — مسجودِ جبیں ہے تو یہی اپنی زمیں ہے

لیکن اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی اختر صاحب کی نظر سے مخفی نہیں ہے، موجودہ تمدن کی چمک دمک کے اندر آلائشوں کا انبار پوشیدہ ہے، عشرت کدوں سے زخمی دلوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں، سلطانی جمہور کے اس زمانہ میں پس ماندہ قوموں کی گرفتاری کے نت نئے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں، گو ایشیا و افریقہ کی قومیں یورپ کے اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرتی جا رہی ہیں لیکن اُن کے افکار و نظریات کے تسلط سے ابھی تک اُن کو آزادی میسر نہیں ہو سکی ہے، اور یہ ذہنی و فکری غلامی طوق و سلاسل کی بندشوں سے بھی بدتر ہے،

گلفشاں قہقہوں کے دامن میں — خونِ حسرت ہے پوچھئے کیا ہو
بہت آزادیوں میں پنہاں ہیں — قفس و دام پوچھئے کیا ہو

———

ہائے وہ فکر و تصور کی غلامی اختر — جس غلامی کے لئے طوق بھی درکار نہ ہو

مادی ترقی کے باوجود انسان اخلاقی حیثیت سے بہت پست ہو گیا ہے، اُس کا دامن اپنے ہی ابنائے جنس کے خون سے آلودہ ہے، اس کے ظلم کے سامنے فلک کا جورِ ستم بھی ہیچ ہو گیا ہے، قتل و غارت کا ہر طرف بازار گرم ہے، اور طبقہ واریت، اور

فرقہ آرائی کی لعنت عام ہو گئی ہے، مثنوی میں انہی حالات کا ذکر ہے، کئی نظموں میں جنگِ عظیم کی ہولناک تباہی اور مغربی قوموں کی بربریت کا عبرتناک منظر بیان ہوا ہے، قحطِ بنگال اور فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر جو نظمیں کہی گئی ہیں، ان سے شاعر کی دردمندی اور دلسوزی کا اندازہ ہوتا ہے، مصنف کے نزدیک یہ ساری لعنتیں موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے پیدا ہوئی ہیں، اسی زرگرانہ تہذیب و ثقافت ہی نے عظمتِ آدم کو پارہ پارہ کر کے انسانوں کے درمیان تفریق و منافرت کی دیواریں کھڑی کر دی ہیں، اس لئے وہ سرمایہ داری کے مہلک اثرات سے دنیا کو نجات دلانے کے لئے آدمیت کی عظمت و برتری کا نقش دلوں میں جاگزیں کرنا چاہتے ہیں اور ایک ایسے سماج کو قائم کرنے کے آرزومند نظر آتے ہیں جس میں خود غرضی اور مفاد پسندی کے بجائے الفت و محبت اور اخوت و بھائی چارگی عام ہو،

نظمِ سرمایہ آدمی کے لئے — طوقِ لعنت ہے پوچھئے کیا ہو
زرگرانہ ثقافت و تہذیب — بربریت ہے پوچھئے کیا ہو

اُن کی طبیعت غیرت مند اور خود دار واقع ہوئی ہے، اس لئے نہ تو کبھی اُن کی زبان دوسروں کی بیجا مدح سرائی سے آلودہ ہوئی، اور نہ اُن کی طبیعت کا میلان کبھی قصیدہ گوئی کی جانب ہوا، اُن کو دوسروں کا منت کش ہونا گوارا نہیں، سرمایہ داروں کی طرح بے رحمی سے مزدوروں کا استحصال کرنے کے بجائے وہ اپنے خون پسینہ کی کمائی کو قابلِ فخر سمجھتے ہیں اور اُن کو جہانِ غیر کے مہر و ماہ کے بجائے اپنے دست و بازو کا تعمیر کردہ نشیمن پسند ہے

اپنی دنیا آپ ہی پیدا کروں میں تو سہی — سایۂ گردوں میں ہو میرا بھلا ممکن نہیں

———

غرق ہو اپنی جبیں کا تو زہر بھی مرغوب — نے جو مفت تو آبِ حیات سے بھی حذر

آخر میں اختر انصاری کا زیادہ رجحان رباعی کی طرف ہو گیا ہے اور بعض رباعیاں

درحقیقت قرآنی آیتوں اور حدیثوں کے منظوم ترجے ہیں، قطعات میں ندرت اور جدت کے علاوہ احساسات کی نزاکت اور جذبات کی لطافت بھی ہے، اُن کی غزلین ایک مضطرب و بے قرار روح اور دردمند دل کی آہ سوزناک اور نالۂ شرربار معلوم ہوتی ہیں نظموں کے موضوع میں تنوع اور رنگارنگی ہے بعض قوم پروری اور حب الوطنی کے جذبات سے معمور ہیں، مندرجہ ذیل فارسی نظم "قطب مینار" سے شاعر کے زورِ بیان، شدتِ تاثر، اور ملی جوش و خروش کا اندازہ کیا جاسکتا ہے،

ہاں دلِ شوریدہ حالم! چشمِ عبرت باز کن — گردشِ ایام رابنگر، الم را ساز کن،
آہ گرم و نالۂ جاں سوز را طیار شو — در فراقِ عزِ ملت دیدۂ خوں بار شو
ایں منارہ را بہ بیں جورِ زماں اندازہ گیر — رفعتِ دیرینۂ اسلامیاں اندازہ گیر
زیں لوائے حق بپرس افسانۂ بزمِ کہن — ہاں بکن سر شار زیں خم خانہ جامِ خویشتن
شیون و آہ و فغاں را عظمتش محتاج نیست — وائے بر تو گر قرارت از الم تاراج نیست

مجموعہ کے آخر میں کئی ممتاز ادیبوں اور نقادوں نے اختر صاحب کی شاعری کے متعلق وقتاً فوقتاً جو کچھ لکھا ہے اس کے اقتباسات درج ہیں،

گو مصنف روایتی شاعری کو پسند نہیں کرتے تاہم انھوں نے مغربی شعر و ادب کی مضحکہ خیز نقالی سے پرہیز کیا ہے، وہ اُردو فارسی اور انگریزی زبانوں سے واقف ہیں، اور انھوں نے مغربی و مشرقی شاعری کے امتزاج سے اپنا ایک منفرد انداز پیدا کیا ہے، اُن کے طرزِ ادا میں دلکشی اور زبان و بیان میں سلاست و روانی ہے،

ایک آدھ آنچ کی کسر تو رہ ہی جاتی ہے، مگر مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ اردو شاعری کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے جو انور بکڈپو مسلم یونیورسٹی مارکٹ علی گڑھ سے پندرہ روپے میں ملے گا،

"ض"

مطبوعاتِ جدیدہ

انسانِ کامل :- مرتبہ - جناب خالد علوی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۰۰، مجلد مع گرد پوش قیمت درج نہیں، پتہ یونیورسٹی بک ایجنسی ۱۹۴، انار کلی - لاہور۔

رسول اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ پر اردو میں بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اور یہ مبارک سلسلہ اب بھی جاری ہے، اسی نئی کتاب میں پہلے آپ کی پاکیزہ زندگی اور پیدائش سے وفات تک کے عام واقعات و حالات تحریر کیے گئے ہیں اور آخر میں مختلف حیثیتوں سے آپ کی سیرت کی جامعیت و کمال کا ذکر ہے۔ اس میں آپ کے ذی وقار شہری سچے اور امانت دار تاجر، بے نظیر خطیب، اولوالعزم مبلغ و داعی، معلمِ انسانیت، داعیِ انقلاب، سپہ سالارِ اعظم، غیر معمولی مدبر و سیاست داں اعلیٰ مقنن و منصف، اور رحمۃ للعالمین ہونے کو مختلف واقعاتِ زندگی کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے، اور معیشت و معاشرت کے متعلق آپؐ کے تصورات اور آپؐ کی گھریلو زندگی کا حال دیا گیا ہے، اکثر بحثوں کی تمہید بھی خاصی ہے سورۂ نجم کی آیت "وما ینطق عن الھویٰ" کے سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے نطق سے تمام اقوالِ رسول اور حکمت سے حدیث مراد لینا صحیح نہیں ہے آپکی عصمت و پیغمبرانہ حیثیت کے متعلق مصنف کا نقطۂ نظر اچھی طرح واضح نہیں ہو سکا ہے۔ گو اس کتاب کی اکثر بحثیں مختلف اردو کتابوں خصوصاً سیرۃ النبی اور خطباتِ مدراس میں آچکی ہیں، تاہم آنحضور صلعم کی سوانح نگاری

بجائے خود نہایت مقدس شغل ہے۔ اس کے لیے مصنف قابل تحسین ہیں۔

بریلوی فتنہ کا نیا روپ ۔ مرتبہ۔ مولوی محمد عارف صاحب سنبھلی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۲۲ مجلد مع گرد پوش قیمت ے پتہ کتب خانہ الفرقان۔ لکھنؤ۔

چند سال پہلے "زلزلہ" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی، جو ہماری نظر سے نہیں گزری، اس میں علمائے دیوبند کی تحریروں اور واقعات سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین کے لیے تو علم غیب اور عالم میں تصرف کی قدرت کے عقیدہ کو کفر و شرک بتاتے ہیں مگر خود اپنے اکابر کو ان ہی اوصاف سے متصف مانتے ہیں، زیر نظر کتاب اسی کے جواب میں لکھی گئی ہے، اس میں صاحب زلزلہ کے مغالطوں کی تردید کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ بزرگان دیوبند کے ان واقعات کا خدا کے لیے مخصوص علم غیب اور تصرف سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ ان کی حیثیت کشف و کرامات وغیرہ کی ہے، اس مقصد کے لیے توحید و شرک کی حقیقت اور مسئلہ علم غیب و تصرف کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، تاہم بعض واقعات کی توجیہ سب کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی، زلزلہ میں علمائے دیوبند کی قوم پروری اور بے داغ سیاسی کردار پر جو حرف گیری کی گئی تھی، اس کا ایک مستقل عنوان کے تحت جواب دیا گیا ہے، آخر میں اس طبقہ کی جس سے زلزلہ کے مصنف کا تعلق ہے مختصر تاریخ اور مضحکہ خیز خصوصیات بیان کی گئی ہیں، جا بجا زلزلہ کے حوالوں اور اقتباسات میں کتر بیونت کے نمونے بھی دکھائے گئے ہیں۔ یہ کتاب اس فن کے پرانے ماہر مولانا محمد منظور نعمانی کی

نگرانی میں محنت سے لکھی گئی اور مدلل ہے۔

زلزلہ در زلزلہ ۔ مرتبہ۔ مولوی نجم الدین صاحب احیائی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۱۲ مجلد مع گرد پوش قیمت بارہ پیسے پتہ۔ ہلال بکڈپو۔ مبارکپور۔ اعظم گڈھ۔ یو۔پی۔

یہ کتاب بھی زلزلہ کے رد میں لکھی گئی ہے، اور تقریباً ان ہی مباحث پر مشتمل ہے جو سابق کتاب میں درج ہیں، اس میں حوالے اور اقتباسات کی غلطیوں پر زیادہ گرفت کی گئی ہے، اس لئے جذباتی انداز اور مناظرانہ رنگ بہت نمایاں ہو گیا ہے اور کہیں کہیں تو وہی لب و لہجہ اور رکیک انداز اختیار کیا گیا ہے، جس کی اس طبقہ سے جس کے رد میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، شکایت کی گئی ہے، مصنف نے دار المصنفین کو اس کی اور علامہ شبلی نعمانیؒ کی کتابوں کے بارے میں صاحب زلزلہ کے حلقہ کے خیالات نقل کرکے خاص طور پر متوجہ کیا ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دار المصنفین کو گزشتہ ساٹھ سال سے اس حلقہ کے علاوہ بعض دوسرے حلقوں کی جانب سے بھی اسی طرح کی باتیں سننی پڑ رہی ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ ان فضول بحثوں کو نظر انداز کرکے اپنے مفید اور ضروری کاموں ہی میں لگا ہوا ہے۔ اگر مسلمان اپنے باہمی اختلافات ہی میں الجھ کر اپنی صلاحیتیں ضائع کرتے رہے تو آنے والا دور ان کے لیے آج کے دور سے بھی زیادہ سخت ہو گا۔ ع

ع ڈرو اُس سے جو وقت ہے آنے والا

ظریفات و مقالات ۔ مرتبہ۔ جناب محی الدین صاحب بدایونی متوسط تقطیع، کاغذ کتابت اچھی صفحات ۔۔ قیمت عہ روپیہ، شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی،

سید محفوظ علی بدایونی مرحوم علی گڑھ کے لائق فرزند، اردو کے ممتاز اہل قلم اور طنز و ظرافت میں بڑے صاحب کمال تھے، مولانا محمد علی مرحوم سے بڑا تعلق رکھتے تھے اور انکے انگریزی اور اردو اخباروں کامریڈ اور ہمدرد کے انتظام و انصرام میں بڑے دخیل بھی تھے، ہمدرد میں تجاہل عامیانہ کا عنوان انہی کی جدت قلم کا نتیجہ تھا انکا تحریری سرمایہ کم ہے تاہم جو کچھ ہے ادب عالیہ کا نمونہ ہے ۱۹۵۶ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے انکے انیس مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا اب سید صاحب کے ہم وطن اور عقیدت مند محی الدین صاحب بدایونی نے بڑے سلیقہ سے تقریباً تین درجن مضامین کا یہ نیا مجموعہ شائع کیا ہے جو آٹھ حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں مولانا محمد علی مرحوم اور تحریک خلافت سے متعلق اور دوسرے میں مزاحیہ مضامین شامل ہیں آخری دو حصے تحقیقی و تاریخی مضامین کیلئے خاص ہیں بقیہ حصوں میں ایک سفرنامہ، تین افسانے، دو تنقیدی اور زبان سے متعلق مضامین دیئے گئے ہیں، یہ رنگارنگ اور مختلف النوع مضامین ادبی رعنائی و لطافت سے معمور اور مصنف کے سنجیدہ و باوقار قلم اور ماقل و مادل تحریر کا نمونہ ہیں ابتدا میں مرحوم کے حالات و کمالات سے متعلق تین مفید مضامین درج ہیں سید محفوظ علی مرحوم جن فرضی ناموں سے اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھتے تھے لائق مرتب نے اپنے مضمون میں ان سب کی مفصل وضاحت کر دی ہے سید صاحب کے فرزند جناب سید امین علی اور مولانا ضیاء احمد بدایونی مرحوم کے سیر حاصل مضامین میں مرحوم کے خاندانی حالات، روزمرہ زندگی کے واقعات، اخلاق و عادات، شرافت و بیداری اور ادبی و علمی ذوق کی پختگی وغیرہ کا ذکر ہے، اس مجموعہ میں حدیث دیگراں کے عنوان سے مشاہیر علم و ادب کے تاثرات بھی نقل کیے گئے ہیں لیکن انکو یکجا اور علحدہ نقل کرنے کے بجائے موقع و محل کے لحاظ سے ہر حصہ مضامین کے ساتھ شامل کیا گیا ہے، مولانا محمد علی، مولوی عبدالحق، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر اقبال، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، رشید احمد صدیقی، حفیظ جالندھری، قاضی عبدالغفار، سید ہاشمی فرید آبادی، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، ابواللیث صدیقی، عبادت بریلوی وغیرہ متعدد ارباب کمال کے تاثرات سے اس مجموعہ کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اردو کے بعض نامور ارباب علم و قلم کو انکے تحریری سرمایہ کی کمی کے باوجود بڑی شہرت و اہمیت حاصل ہے، سید محفوظ علی بدایونی کا شمار بھی اسی زمرہ میں ہونا چاہئے مگر افسوس ہے انکو خاطر خواہ شہرت نہ ملی، ایسے باکمال ادیب کے ادب پاروں کو تلاش و جستجو سے مرتب کر کے شائع کرنا ایک مفید ادبی خدمت ہے اسکیلئے لائق مرتب ارباب ذوق کے شکریے کے مستحق ہیں۔ "ض"

جلد ۱۱۶ ماہ نومبر ۱۹۷۵ء مطابق ماہ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ عدد ۵

مضامین

مقالات